HISTORY OF THE CHURCH IN INDIA.

PART II

THE FIRST FIFTEEN CENTURIES.

BY

REVD. CANON BARAKAT ULLAH, M.A., F.R.A.S.

تاریخ کلیسائے ہندوستان

حصہ دوم

صلیب کے ہراول

مصنفہ

پادری کینن برکت اللہ صاحب۔ ایم۔ اے

فیلو آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن

بار اول ——— قیمت دو روپیہ ۸/

(سہ وکسی پریس نئی دہلی)

HISTORY OF THE CHURCH IN INDIA.
PART II.

THE FIRST FIFTEEN CENTURIES

BY

Revd. Canon Barakat Ullah, M.A., F.R.A.S.

تاریخ کلیسیائے ہندوستان

حصہ دوم

صلیب کے ہراول

مصنفہ

پادری کینن برکت اللہ ایم۔ اے

فیلو آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن)

مصنف

صحتِ کتبِ مقدسہ۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم۔ محمد عربی صلیب کے علمبردار۔
مسیحیت اور سائنس۔ نور الہدیٰ، اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی؟
کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟ دشتِ کربلا یا کوہ کلوری؟ وغیرہ

ملنے کا پتہ:۔ پادری برکت اللہ۔ انارکلی۔ بٹالہ۔ پنجاب۔ ہند۔

بارِ اول (دلی پرنٹنگ ورکس دہلی) قیمت ۱۲/

یادگار

مشرقی کلیسیا کے
لاکھوں صلیب کے جان نثاروں کے نام
جنہوں نے
منجئ جہان کی والہانہ محبت میں اپنے دیس کو چھوڑا
اور ہمارے ملک میں آکر انجیلِ جلیل کا جانفزا
پیغام سُنایا

برکت اللہ

دیباچہ

"تاریخ کلیسیائے ہند کے پہلے حصہ میں ہم نے خداوند مسیح کے شاگرد مقدس توما کے ہندوستان میں آنے کی روایت کی تنقیح و تنقید کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ رسول پہلے پہل پنجاب میں تشریف فرما ہوئے اور یہاں کلیسیائیں قایم کرکے جنوبی ہند کے مغربی ساحل مالابار چلے گئے۔ وہاں آپ کی تبلیغی مساعی اس قدر بارور ہوئیں کہ آپ نے سات کلیسیائیں قایم کیں۔ اس کے بعد آپ نے مشرقی ساحل کورومنڈل کا رُخ کیا اور وہاں جابجا کلیسیائیں قایم کیں۔ بالآخر آپ مدراس کے قریب شہید کئے گئے اور آپ کا مزار مبارک مائلاپور میں موجود ہے"۔

یہ کتاب جو اب ناظرین کے سامنے ہے۔ اِس سلسلہ کا دوسرا حصہ ہے۔ اور اِس میں وہ تمام واقعات درج کئے گئے ہیں جن کا دوسری صدی سے لیکر پندرھویں صدی کے آخر تک (یعنی پرتگیزوں کی آمد تک) پتہ چلتا ہے۔ تاریخ بالعموم ان پندرہ صدیوں کی نسبت بہت کچھ نہیں بتلاتی۔ لیکن ہم نے مختلف ماخذوں سے (جن کا ذکر حصہ اوّل کے دیباچہ میں کیا گیا ہے۔) بڑی عرق ریزی سے واقعات کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک مؤلف کو علم ہے ان واقعات کو تاحال کسی زبان میں بھی ایک جگہ جمع نہیں کیا گیا۔ میری دعا ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے

ہندوستان اور پاکستان کی مسیحی کلیسیایئں تبلیغ کے اہم فرض کی جانب رجوع کریں
یہ حصہ پرتگیزوں کی آمد کے زمانہ تک ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرے حصہ میں
پرتگیزوں کے آنے کے وقت سے لے کر موجودہ زمانہ تک جنوبی ہند کی کلیسیاؤں
کا ذکر ہوگا۔ یہ حصہ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

ناظرین کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس رسالہ میں لفظ "ہندوستان" سے مراد
وہ برِّ عظیم ہے جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بٹوارہ سے پہلے ہندوستان کہلاتا تھا
اور جس میں اب پاکستان اور ہندوستان دونوں شامل ہیں۔

اس کتاب کے آخر میں مختلف ابواب کے تحت انگریزی کتب کے حوالجات
سلسلہ وار درج کئے گئے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ تصاویر دلچسپی کا موجب ثابت ہوں گی اور جدولِ
واقعات اور نقشہ جات اس کتاب کے مطالعہ میں مدد دیں گے۔

انار کلی۔ بٹالہ پنجاب
یکم اپریل ۱۹۴۹ء

برکت اللہ

فہرستِ مضامین

صفحہ

صفحہ

بابِ اوّل

نقشِ پائے رسولِ شہید

ہندوستان کی تاریخ ابتدائی مسیحی صدیوں کی نسبت خاموش ہے یہی وجہ ہے کہ گو جس زمانہ کا ہم اس رسالہ میں ذکر کریں گے وہ قریباً ڈیڑھ ہزار سال کا طویل عرصہ ہے تاہم اس کے حالات ایک مختصر کتاب میں سما سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسیحی مشرق و مغرب کی زندہ اور زبردست کلیساؤں کے مرکزوں سے دُور شرک اور بُت پرستی کے حسین قلعوں کے درمیان نیم تاریکی کی حالت میں پڑے زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ گو اسکندریہ کی کلیسا کے مسیحی فضلاء کے علم و فلسفہ کی ہر جگہ دھوم مچی ہوئی تھی، لیکن دریائے سندھ اور گنگا پار کے رہنے والے مسیحی اور جنوبی ہند کے مسیحی اس مشرقی کلیسا کے علمی خزانوں سے بے بہرہ دکھائی دیتے ہیں۔ دُنیا کے اُس وقت کے سیاسی حالات کی وجہ سے وہ روم کی کلیسا کے روز افزوں اثر اور حلقہ سے بھی باہر تھے۔ شام اور مسوپتامیہ کی کلیساؤں کے تبلیغی جوش کا دریا ہر چند موج زن تھا لیکن برِ عظیم ہندوستان کی کلیسا اس معاملہ میں بھی ساکت نظر آتی ہے۔

یہ امر ہمارے لئے نہایت حیرت انگیز ہے کیونکہ ہندوستان دُنیا کے اُن

معدودے چند ممالک میں سے تھا جس کو یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ منجی عالمین کے
۱۲
دوازدہ رسولوں میں سے ایک اس کی سرزمین میں آکر صلیب کا جھنڈا گاڑے جیسا
ہم حصہ اوّل میں ثابت کر چکے ہیں، مقدس توما رسول نے ہندوستان کے شمال مغرب
اور پنجاب میں اور جنوبی ہند کے دونوں ساحلوں کے شہروں میں متعدد کلیسیائیں قایم
کی تھیں۔ اور اُن کلیسیاؤں کے متعدد سربرآوردہ اور چیدہ لوگوں کی تقدیس کرکے
جن کو بشپ کے جلیل القدر عہدہ پر سرفراز بھی فرمایا تھا۔ لیکن نامعلوم حالات کی وجہ
سے آپ کی شہادت کے بعد اس ملک میں پیٹریارکیٹ قایم نہ ہوئی جس طرح روم،
یروشلم، انطاکیہ، سکندریہ وغیرہ شہروں میں قایم ہوگئی تھی۔ تاریخ ہم کو یہ نہیں بتاتی
کہ ان ابتدائی صدیوں میں ہندوستانی بشپوں کے سلسلہ کی راہ میں کیا رکاوٹیں حائل
ہوئیں کہ وہ منقطع ہوگیا۔ واجب تو یہی تھا کہ رسول کی شہادت کے بعد آپ کا جانشین
بشپ پیٹریارک ہو جاتا اور کلیسیائے ہند میں باقاعدہ رسولی سلسلہ قایم رہتا
جو موجودہ زمانہ تک متواتر چلا آتا اور اس برِّ اعظم کی کلیسیا مشرق کی قدیم کلیسیاؤں
میں سے ایک سربرآوردہ کلیسیا ہوتی۔ لیکن اس کے برعکس قدیم زمانہ ہی سے
یہاں نہ کوئی پیٹریارک نظر آتا ہے اور نہ ہندوستانی بشپوں کا سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔
اس پر طرہ یہ کہ ہندوستان کے مسیحی ہمیشہ تاریخ کی جانب سے بے نیاز رہے ہیں۔
ابتدائی قرون میں ہم کو اس برِّ اعظم میں قیصریہ کے بشپ یوسیبئیس
(Eusebius of Caesarea.) جیسا کوئی مورّخ کلیسیا
نہیں ملتا۔ کسی ہندوستانی مسیحی کے دل میں یہ خیال نہ آیا کہ وہ اپنے دیش کی کلیسیا
کی تاریخ کی جانب متوجہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ افغانستان اور بلوچستان
کے جنوب سے لیکر بحرِ ہند تک کے دور دراز خطہ کی کلیسیاؤں کے وجود کا اگر ہمیں تھوڑا بہت
علم ہے تو وہ ہندوستان کے مسیحیوں کی طفیل نہیں بلکہ شامی اور یونانی مسیحی مصنفین کی بدولت

حاصل ہوا ہے۔ وہ اپنے ممالک کی کلیساؤں کی تاریخ لکھنے کے دوران میں ہندوستان کی
کلیساؤں کا کہیں کہیں سرسری اور ضمنی طور پر تذکرہ کرتے ہیں جس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ
ہند کے طول و عرض میں ان قدیم صدیوں کے دوران میں ہندو دھرم اور بدھ مت وغیرہ کے
دوش بدوش مسیحیت بھی موجود تھی۔ اور مختلف مقامات میں اکثر اوقات ٹمٹماتے چراغ کی طرح
روشن تھی۔ ان شامی اور یونانی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دیش میں جہاں
پردیسی مسیحی مثلاً رومی، ایرانی، ارامی، یونانی وغیرہ اقوام کے مسیحی رہتے تھے، وہاں خالص ہندی
نژاد مسیحیوں کی بھی اکثریت موجود تھی۔ جو شرک اور بت پرستی کو ترک کرکے مسیحی عالمین پر ان مبلغین
کے ذریعہ ایمان لائے تھے جن کو سکندریہ، ایران اور مسوپتامیہ کی کلیساؤں نے وقتاً
فوقتاً ہندوستان بھیجا تھا۔

سکندریہ کا مقدس پنٹینس (سنہ ۱۹۰ء)

–Pantaenus of Alexandria C. 190.

مقدس توما کو جام شہادت پیئے ایک سو سال سے زائد عرصہ گذر چکا
ہے۔ تاریخ تاحال اس طویل مگر اہم زمانہ کی نسبت خاموش ہے۔ یہ پتہ نہیں
چلتا کہ جو کلیسیائیں مقدس توما رسولِ شہید نے قائم کی تھیں اُن کا اِس ایک
سو سال میں کیا حشر ہوا۔ مشرک بت پرست ہندوؤں نے واحد خدا کو ماننے
والے مسیح کے شیدائیوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا اور ان پر کیا مظالم ڈھائے
برہمنوں نے اپنے فلسفہ کے زور سے اور عوام الناس نے لطائف الحیل سے
ان بیدو صلاحیات کس طرح تنگ کیا اور اِن صلیب کا پرچم لہرانے والوں نے کن
آفات کا دلیرانہ مقابلہ کرکے اپنے "ایمان کو تھامے رکھا۔"
سنہ ۱۹۰ء کے قریب تاریکی کا پردہ اٹھتا ہے اور ہم کو ذرا سی جھلک دکھائی
دیتی ہے جس کے بعد پردہ پھر گر جاتا ہے۔ اس جھلک کی روشنی میں سکندریہ کی

زبردست کلیسا کا اُستاد وحید العصر علامۂ زمان مقدس پینٹینس ہندوستان کے ایک گوشہ میں بطور ایک مبلغ چلتا پھرتا نظر آتا ہے ۔

سکندریہ اور اس کی کلیسا

خداوند مسیح کی آمد سے تقریباً تین صدیاں پیشتر سکندر اعظم نے شہر سکندریہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اُس کی یہ تمنا تھی کہ یہ شہر جس کو اُس نے خود اپنا نام دیا تھا اقوام عالم کی تجارت کی منڈی اور مشرق و مغرب کو یکجا کرنے والا بین الاقوامی مرکز ہو جائے ۔ اور اُس کی یہ خواہش پوری بھی ہو گئی تھی جس وقت کا ہم ذکر کرتے ہیں یعنی دوسری صدی مسیحی میں سکندریہ تمام شہروں سے زیادہ متمول تھا اور اس کا نام کل مہذب اقوام میں مشہور تھا جیسا ہم حصۂ اوّل کے باب سوم میں بتا چکے ہیں، اس شہر کے ساتھ ہمارے وطنِ عزیز ہندوستان کے تجارتی تعلقات نہایت وسیع پیمانہ پر جاری تھے۔ یہ شہر نہ صرف تجارت کے لئے دنیا بھر میں مشہور تھا بلکہ علم و فضل کے لحاظ سے بھی دنیا کا مرکز تھا۔ سکندریہ کی یونیورسٹی شہرۂ آفاق تھی اور سکندریہ جیسا کتب خانہ روئے زمین پر موجود نہ تھا فلسفہ میں اس شہر کو انتہائی شہرت حاصل تھی۔ یہودی عالم فائلو (جس نے یہودیت اور یونانی فلسفہ کو تطبیق دینے کی کوشش کی تھی) اسی جگہ کا باشندہ تھا۔ عہد عتیق کا مشہور ترجمہ سبعینہ (Septuagint) جس کا استعمال خداوند مسیح کے زمانہ میں بھی رائج تھا۔ اسی شہر میں سنِ عیسوی سے دو صدیاں پہلے کیا گیا تھا۔ الغرض یہ شہر جس طرح دولت و ثروت اور تجارت کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھا اُسی طرح علم و فضل اور حکمت و فلسفہ کے لحاظ سے بھی تمام دنیا میں بے نظیر اور لاثانی تھا ۔

یہ امر ناممکن تھا کہ اس پایہ کا شہر مسیحی مبلغین کی تبلیغی مساعی سے

محروم رہتا۔ روایت ہے کہ مقدس مرقس نے اس جگہ مسیحی کلیسیا کی بنیاد ڈالی۔ یہ ایک لازمی بات تھی کہ شہر کے اردگرد کے حالات اس جگہ کی کلیسیا پر اپنا اثر ڈالتے۔ پس اس کلیسیا کی نشوونما میں علم وفضل حکمت اور فلسفہ نے نمایاں حصہ لیا۔ مسیحیت نے اس شہر میں حکمت اور فلسفہ کے ماحول میں جڑ پکڑی کلیسیا کے بیشتر ارکان کفر کی حالت میں علم وفلسفہ میں نام پیدا کر چکے تھے پس سکندریہ میں ہر وقت بحث ومباحثہ کا بازار گرم رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علم وفضل کے گڑھ میں مسیحی علم الہیات کا ایک کالج قایم کیا گیا جس میں غیر مسیحی ادیان پر اور مسیحیت اور مسیحی عقائد پر مسیحی فضلائے روزگار درس دیتے تھے۔ لہٰذا یہ شہر نہ صرف دنیاوی دولت اور علم وفلسفہ کے لحاظ سے یگانۂ روزگار رہا بلکہ مسیحی الہیات اور مسیحی فلسفہ کے لحاظ سے بھی یکتائے زمانہ تھا۔ تمام مسیحی کلیسیاؤں کی نگاہیں مسیحی فلسفیانہ امور کو معلوم کرنے کے لئے سکندریہ کی کلیسیا کی جانب اٹھتی تھیں چنانچہ اُس زمانہ میں صرف اِسی شہر کے بشپ کو پوپ کہتے تھے اور نیکایاہ کی کونسل (۳۲۵ء) کے بعد اس کو "منصفِ عالم" کا خطاب مِلا جس کے فتوے کے سامنے کلیسیائے جامع سرِ تسلیم خم کرتی تھی۔ انہی وجوہ کی بنا پر نیزی آنزم کا بشپ گریگوری کہتا ہے کہ

"سکندریہ کی کلیسیا کا سردار تمام دنیا کا سردار ہے"

مقدس ڈیمیٹریس

۱۸۹ء میں ڈیمیٹریس (Demetrius.) سکندریہ کی کلیسیا کا بشپ ہوا وہ کسی مقتدر یا متمول خاندان کا فرد نہیں تھا۔ لیکن خداداد قابلیت اور حُسنِ انتظام کی وجہ سے بیالیس سال تک نہایت خوش اسلوبی سے کلیسیا کا انتظام کرتا رہا۔ اس کے زمانہ میں سکندریہ کا مدرسۂ الٰہیات کالج بنا دیا گیا جس کے پرنسپل ایسے اشخاص ہوئے جنہوں نے اپنے علم وفضل کی وجہ سے یکے بعد دیگرے اپنے تمام قابل پیشروؤں کو بھی مات کر دیا۔ چنانچہ

ان فضلاء میں سے پنٹینس، کلیمنٹ - اوریجن (-Origen.) کے نام کلیسیائے جامع کی تاریخ میں تا ابد درخشاں رہیں گے -

مقدس پنٹینس (جس کا ہم اب ذکر کریں گے) کلیمنٹ اور آوریجن جیسے مسلم الثبوت اُستادوں کا اُستاد تھا۔ وہ عبرانی نسل کا تھا اور جزیرۂ سسلی میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کی تعلیم یونان کے مشہور شہر ایتھنز (-Athens.) میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنے طالب علمی کے زمانہ میں بھی اپنے ہمعصروں میں ممتاز تھا۔ یہ شہر ابتدا ہی سے حکمت و فلسفہ کے لئے مشہور تھا۔ اور پنٹینس یہاں فلسفہ کا اُستاد تھا۔ وہ فلسفہ کے مسلکِ انتخابیت کا پیرو (-Ecclecticism.) تھا اور سلوئیقی اور فیثاغورس (Pythagoras) کے خیالات کا معتقد تھا۔ جب اس کو مسیحؑ خالقین کے قدموں میں آنے کی سعادت نصیب ہوئی تو وہ سنہ ۱۸۱ء میں مدرسۂ الٰہیات کا (جو حال ہی میں کالج بنایا گیا تھا) پرنسپل مقرر ہوا۔ اس نے متعدد کتابیں لکھیں جو زمانہ کے ہاتھوں سے نہ بچ سکیں۔ اس کے علم و فضل کی نسبت اس کا شاگرد کلیمنٹ (جو اس کے وسیلے مسیح پر ایمان لایا تھا اور اس کے بعد کالج کا پرنسپل بنا) لکھتا ہے

"میں اس کے علم و فضل کی شہرت سن کر مصر آیا اور اس کے ذریعہ میری روح نے آرام حاصل کیا۔ وہ شہد کی مکھی کی طرح تھا جس نے نبیوں اور رسولوں کی مرغزاروں کے پھولوں سے علم اکٹھا کیا تھا۔ اس کو اپنے سامعین کے دلوں میں علم و تحقیق کی غیر فانی خواہش پیدا کرنے میں کمال حاصل تھا"

(۱)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کے ہندو پنڈتوں اور ودیادان برہمنوں نے غریب ہندوستانی کلیسیا کا دم ناک میں کر رکھا تھا اور انھوں نے حکمت اور

فلسفہ کے زور سے بہتوں کو صراطِ مستقیم سے گمراہ کر دیا تھا۔ ہند کی کلیسیا میں غالباً اُن کی ٹکر کا کوئی عالم نہ تھا، پس مسیحیوں کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر چند سے یہی حالت رہی تو بہت اشخاص راہِ حق اور زندگی سے منہ موڑ کر چاہِ ضلالت میں گر جائیں گے۔ پس اُنھوں نے قدرتاً سکندریہ کی کلیسیا کی جانب رُخ کیا جو علمِ فلسفہ کے لئے چاروانگ عالم میں مشہور تھی۔ سنہ ۱۹۰ء میں ہندوستانی کلیسیا نے بشپ ڈیمیٹریس کے پاس ایک وفد بھیجکر اُس کی منت کی کہ ایک مسیحی عالم کو اُن کے پاس بھیج۔ سکندریہ کی کلیسیا کے روحانی اور تبلیغی جوش کا اِس ایک بات سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ بشپ ڈیمیٹریس نے فلاسفہ کے سرتاج اور ماہرِ دینیات یگانۂ روزگار پنٹینس کو اس مبارک مقصد کے لئے ہندوستان جانے کو کہا اور ایسے پایہ کا شخص بذاتِ خود ہندوستان آنے کے لئے بلا چون و چرا تیار ہو گیا۔ وہ ہندوستان کے فلسفیانہ خیالات سے بخوبی واقف تھا کیونکہ اکثر تو سکندریہ میں ہندوستان کے لوگ بکثرت آیا جایا کرتے تھے چنانچہ ڈائن کیسیس (—Dion Cassius.

سنہ ۲۰۰ء کے قریب لکھتا ہے کہ عرب، بکتریا، سکندریہ، ایران اور ہندوستان کے لوگ جوق در جوق سکندریہ آیا کرتے تھے اور اس کے علاوہ سکندریہ کے مروجہ فلسفہ میں ہندی فلسفہ اور خیالات کی جھلک پائی جاتی تھی۔ پس وہ ہر لحاظ سے ہندوستان کی کلیسیا کی مشکل کو سلجھانے اور سنبھالنے پر قادر تھا۔ اس کے شاگرد کلیمنٹ نے عارضی طور پر کالج کی عنان اپنے ہاتھوں میں لے لی اور وہ انجیل کی خاطر علمی مشاغل کو چھوڑ، آرام و شہرت پر لات مار اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال خدا کا نام لے کر سکندریہ سے ہندوستان کی جانب چل پڑا۔ اس کے نمونہ نے کلیسیا کو سکھلایا ہے کہ خداوند کی نجات کی تبلیغ کے سامنے اعلیٰ ترین عہدہ اور علمی مشاغل سب ہیچ ہیں اور صلیب کے پیغام کی خاطر۔ رتبہ، علم، زر۔ آسائش و آرام وغیرہ کو

قربان کرنے والوں ہی کو سعادتِ دارین نصیب ہوتی ہے۔

قرونِ اُولیٰ کا مورخ قیصریہ کا بشپ یوسیبئس

Eusebius of Caesarea (از ۲۶۵ء تا ۳۴۰ء) پنٹینس کی بابت لکھتا ہے:-

"اس زمانہ (سنہ ۱۸۰ء) میں سکندریہ کے مومنین کے مدرسہ کا پرنسپل پنٹینس تھا جس کے علم و فضل کی ہر جگہ دھوم مچی تھی۔ دینیات کا یہ مدرسہ زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے اور ہمارے زمانہ میں بھی موجود ہے۔ ابتدا ہی سے ہمیشہ ذی علم اصحاب اور فصیح البیان لسان فضلا رہی اس میں مدرس کے فرائض سر انجام دیتے رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فلاسفر پنٹینس اپنے زمانہ کا لاثانی عالم تھا اور پہلے سٹوئیکی فلسفہ کا قائل تھا۔ وہ کلام اللہ کی اشاعت میں ایسا جوشیلا تھا کہ مشرقی اقوام کے لئے مسیح کی انجیل کا پیشرو بنا اور ہندوستان کو گیا۔ اُن دنوں میں کلام کے ایسے مبشر ہوا کرتے تھے جو رسولی نمونہ پر چل کر کلام اللہ کی اشاعت اور کلیسیا کی توسیع کی خاطر سر توڑ کوششیں کیا کرتے تھے۔ ایسے سعید لوگوں کے شمار میں پنٹینس کا نام بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ ہندوستان گیا تو وہاں اس کو ایسے لوگ ملے جن میں رسول برتلمائی نے منادی کی تھی اور یہ رسول اُن لوگوں کے لئے انجیل متی کا ایک نسخہ عبرانی (ارامی) زبان میں چھوڑ گئے تھے جو اُس وقت تک اُن کے پاس محفوظ تھا۔ وہ لوگ انجیل متی سے بخوبی واقف تھے پنٹینس نے ان میں نہایت قابلِ تعریف کام کیا۔ جب وہ واپس اسکندریہ گیا تو اُس نے دینیات کے کالج کی

عنان اپنے ہاتھوں بیچ لی اور وہاں وہ کلام حق یعنے خزائن کے مطالب زبان اور قلم دونوں سے بیان کرتا رہا۔"

مقدس جیروم (-Jerome.) از ۳۴۰ء تا ۴۲۰ء کا بیان بھی قیصریہ کے بشپ کے بیان کے مطابق ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"پنٹینس سٹوئیکی فرقہ کا فلاسفر تھا..... وہ نہایت دانشمند اور ذی علم شخص تھا اور دینی اور دنیاوی علوم میں کامل دسترس رکھتا تھا۔

ہندوستانیوں کے وفد کی درخواست پر سکندریہ کے بشپ ڈیمیٹریس نے اس کو ہندوستان بھیجا۔ وہاں جا کر اس کو معلوم ہوا کہ برتلمائی نے جو بارہ رسولوں میں سے تھا اُن لوگوں میں خداوند کی خوشخبری کی انجیل متی کے مطابق منادی کی تھی۔ انجیل کا یہ نسخہ عبرانی (آرامی) زبان میں لکھا تھا۔ جب پنٹینس واپس سکندریہ آیا تو وہ اس نسخہ کو اپنے ہمراہ لے آیا۔"[۱۲]

ایک اور جگہ جیروم لکھتا ہے۔

پنٹینس صاحب علم و فضل تھا۔ ڈیمیٹریس نے اس کو ہندوستان بھیجا تاکہ وہ اس ملک کے فلاسفروں اور برہمنوں میں منادی کرے۔"[۱۳]

پنٹینس کے ذریعہ کلیمنٹ اور اوریجن کو جو اس کے شاگرد رشید تھے ہندوستان اور ہندوستانیوں کی نسبت علم ہوا چنانچہ کلیمنٹ اپنی تصنیفات میں ہندوستان کے بیراگیوں (-Gymnosophists.) اور دیگر فلاسفروں (Barbarian Philosophers.) کا نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ اس سے قدرتاً ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں

کہ اس کو ان تفصیلات کا علم پینٹنس سے ہی ملا ہو گا جو ان باتوں کا چشم دید گواہ تھا چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

"ان فلاسفہ کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم کو سارمینی -Sarmanae. کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے فلاسفہ کو برہمن کہتے ہیں۔ سارمینی میں سے بعض بادہ نشین ا(-Hylobii.) ہیں جو شہروں میں بود و باش نہیں کرتے اور نہ کسی چھت کے نیچے رہتے ہیں وہ درختوں کی چھال پہنتے ہیں۔ گری دار میووں اور پھلوں پر گذارہ کرتے ہیں اور چلو میں پانی پیتے ہیں۔ دورِ حاضرہ کے اینکریٹائیٹس ع(-Encretites.) کی طرح وہ نہ شادی کرتے ہیں اور نہ اُن کے ہاں اولاد ہوتی ہے۔"

اگر پینٹنس کی تصنیفات زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہتیں تو ہمیں بالتفصیل پتہ لگ جاتا کہ جو وفد بشپ ڈیمٹریس کے پاس گیا تھا اس کے ارکان کون تھے اور ہندوستان کے کس گوشہ کے رہنے والے تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ پینٹنس ہندوستان کے کس کس حصہ میں گیا تھا اور کتنی مدت کہاں رہا۔ اس کا سابقہ کن برہمنوں سے پڑا اور اس نے کس مسلک اور فرقہ کے فلاسفروں کے ساتھ کن مضامین پر بحث کی اور اس کی تبلیغی مساعی کا کیا نتیجہ ہوا۔ وہ مسیحی کون تھے جو رسول برتلمائی کے ذریعہ مشرف بہ مسیحیت ہوئے تھے ان کا کلیسیائی نظام کیا تھا اور وہ کس پیٹریارک کے ماتحت تھے، کیا وہ کلیسیا زندہ تھی یا نیم مردہ حالت میں سسک رہی تھی۔ انجیل متی کا ارامی نسخہ کس قسم کا تھا، کیا موجودہ انجیل متی کے

ع یہ ایک بدعتی مسیحی فرقہ تھا جس کے پیرو شراب گوشت اور نکاح سے پرہیز کرتے تھے۔ (برکت اللہ)

مطابق تھا یا کیا مروجہ یونانی متن اُس ارامی متن کا لفظی ترجمہ تھا؟ وغیرہ وغیرہ لیکن آفاتِ زمانہ کے ہاتھوں اس علامۂ زمان کی کوئی کتاب نہیں بچی۔ ممکن ہے کہ محکمۂ آثارِ قدیمہ زمانۂ مستقبل میں مصر کے ریگستان میں سے اس کی کوئی تصنیف کھود نکالے اور ہم کو ان سوالوں کے جواب مل جائیں۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مقدس پنٹینس نے ہندوستان میں صرف تھوڑی سی مدت کے لئے ہی قیام کیا تھا لیکن اس قلیل عرصہ میں اس نے برہمنوں میں اور دیگر فلاسفہ کے درمیان تبلیغ کر کے ان لوگوں کے دانت کھٹے کر دیئے جن کے نزدیک ہمارے زمانہ کے مبلغین پھیکے ڈرتے ہیں۔ اس کا ہندوستان میں آنا اس قدر مفید ثابت ہوا اور اُس کی مساعی ایسی بارور ہوئیں کہ اس کے بعد سکندریہ کی کلیسا نے کسی اور قابل شخص کو ہندوستان بھیجنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

پنٹینس نے سکندریہ واپس جا کر دینیات کے کالج میں اپنا کام ۲۱۱ء تک جاری رکھا۔ اس سال وہ ایک ایذا رسانی کے دوران میں شہید کر دیا گیا۔ اور کلیسیا ہر سال ۷ جولائی کے روز اس کی یاد کو تازہ کرتی ہے۔ خدا وہ دن جلد لائے جب خود مختار ہندوستانی کلیسیا بھی اس عالم بزرگ اور شہید کی یادگاری کرے جس نے اُس کی خاطر ایک مدت کے لئے اپنے وطن عزیز و اقارب اور علمی مشاغل کو ترک کر دیا تھا۔

(۲)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقدس پنٹینس ہندوستان کے کس حصہ میں گیا تھا؟ بدقسمتی سے اُس زمانہ میں جیسا ہم حصۂ اول کے باب چہارم کی فصلِ اول میں بتا چکے ہیں لفظ "ہندوستان" کا کوئی خاص مفہوم متعین نہیں تھا بلکہ افریقہ کے مشرقی ساحل سے لے کر جاپان تک کے خطۂ زمین کو

بعض اوقات "ہندوستان" کہا جاتا تھا۔ ان ممالک کی تین طرح پر تقسیم کی
جاتی تھی بڑا ہند۔ متوسط ہند، اور چھوٹا ہند۔ "بڑے ہند" میں موجودہ
ہندوستان لنکا اور سلطنتِ چین شامل تھیں۔ "متوسط ہند" میں حبش
جنوبی عرب، سکوترہ، زنجبار اور دیگر جزائر جزیرہ مدغاسکر تک شامل تھے اور
"چھوٹا ہند" یا "ہندِ بعید" میں ملاکا اور دیگر ہزاروں جزیرے جاپان تک شامل
تھے۔ پس ظاہر ہے کہ دوسری صدی میں لفظ "ہندوستان" کا اطلاق موجودہ
ہندوستان کے علاوہ بحیرۂ احمر کے دونوں جانب کے ممالک مثلاً ابی سینیا یا حبش،
حمیری عرب، یمن وغیرہ پر بھی کیا جاتا تھا، اس بناء پر بعض علما مثلاً موشیم

Bishop Medlycott. (میڈلی کاٹ) -Mosheim.

منگانا وغیرہ کہتے ہیں کہ مقدس پنٹینس جس "ہندوستان"
میں گیا تھا، وہ عرب کا جنوبی ساحل اور یمن کا ملک تھا لیکن جیروم صاف
اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ پنٹینس کو خاص اس مقصد کی خاطر بھیجا گیا تھا
کہ وہ "ہندوستان کے فلاسفروں اور برہمنوں میں منادی کرے" عرب کے
جنوبی ساحل اور یمن کے ملک میں نہ فلاسفر رہتے تھے اور نہ برہمن بستے تھے۔
علاوہ ازیں جیروم ارضِ مقدس میں رہ چکا تھا اور اس بات کا اہل تھا کہ جنوبی
عرب اور ہندوستان میں تمیز کر سکتا اور یہ بات بھی اغلب ہے کہ اس کے
زمانہ میں مقدس پنٹینس کی تصنیفات مروج تھیں اور علما کے ہاتھوں میں موجود
تھیں۔ کلیمنٹ کے مندرجہ بالا تفصیلی بیان کے بعد کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی
کہ جس ہندوستان میں پنٹینس گیا تھا وہ موجودہ ہندوستان کا ہی کوئی حصہ
تھا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ پنٹینس نے برہمنوں اور سارمینی لوگوں میں کام کیا تھا
سارمینی بدھ مت کے پیرو تھے اور تپسوی ریاضت کیا کرتے تھے۔ دوسری

صدی مسیحی میں بدھ اور برہمن مل جل کر کام کیا کرتے تھے۔ ان دونوں کا باہمی تعاون چینی سیاح ہیون سانگ (Hiuen Tsang) (از ۶۲۹ء تا ۶۴۵ء) کے وقت میں بھی موجود تھا۔ ساتویں صدی مسیحی کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے تھے پس کلیمنٹ کے الفاظ تاریخی لحاظ سے درست بھی ہیں کیونکہ وہ کہتا ہے کہ پنٹینس نے برہمنوں اور سارمینی فرقہ کے لوگوں میں (جو اس زمانہ میں ایک دوسرے کے اتحادی تھے) تبلیغ کی تھی اور یہ دونوں فرقے صرف ہندوستان میں ہی موجود تھے۔

(۳)

یہ بات قابلِ غور ہے کہ جس ہندوستانی کلیسیا کے درمیان مقدس پنٹینس نے تبلیغی خدمت کی تھی وہ مقدس توما رسول کے بپتسمہ یافتگان کی اولاد نہیں تھے کیونکہ اس کلیسیا کے آبا و اجداد مقدس برتلمائی کے ذریعہ مشرف بہ مسیحیت ہوئے تھے۔ پس ہندوستان کا یہ گوشہ نہ تو پنجاب تھا اور نہ ساحل کورومنڈل اور ساحل مالابار کے وہ حصے تھے جہاں مقدس توما نے ایک صدی پیشتر کلیسیائیں قایم کی تھیں اور جہاں آپ کا مزار مبارک تھا اور جہاں کی کلیسیائیں ہر سال آپ کا عرس منائی تھیں۔ مورخ شنیڈر کا قیاس ہمیں معقول معلوم ہوتا ہے کہ جس ہندوستانی کلیسیا کے پاس مقدس پنٹینس گئے تھے وہ یہودی نسل کے مسیحی تھے جن کے آبا و اجداد مغربی ہند کے کسی گوشہ میں آ بسے تھے چونکہ پنٹینس خود عبرانی نسل کے تھے غالباً اسی واسطے بشپ ڈیمیٹریس کی نظرِ انتخاب آپ پر پڑی اور آپ عبرانی نسل کے مسیحیوں کی مدد کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ اس گوشہ کی کلیسیا میں ہندی نژاد مسیحی بھی ضرور شامل ہوں گے جو مشرک بت پرست اقوام میں سے

مسیحی عالمین کے قدموں میں آ گئے ہوں گے چنانچہ یہ مؤرخ کہتا ہے کہ

"عبرانی (ارامی) انجیل کا ذکر اس قیاس کا مؤید ہے کہ یہودی مسیحی بھی اس زمانہ میں مالابار کے ساحل پر آباد تھے۔ یوسیبئس کا بیان ظاہر کرتا ہے کہ اس کے خیال میں جس "ہندوستان" میں پینٹینس گیا تھا وہ عرب سے دور فاصلہ پر واقع تھا اور اس کا مطلب موجودہ ہندوستان سے تھا"۔

سر ولیم ہنٹر جو تاریخ ہند کے ماہر ہیں کہتے ہیں کہ

"رسولی زمانہ میں ساحل مالابار پر اہلِ یہود کی بستی تھی۔ دوسری صدی مسیحی میں عبرانی نسل کے مسیحی سوداگر اور دیگر اقوام کے مسیحی سوداگر تجارت کی خاطر مالابار میں بستے تھے"۔

اس نظریہ کو اس بات سے بھی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ پہلی صدی مسیحی میں سکندریہ اور بابل میں یہودی بکثرت آباد تھے۔ سکندریہ اور اس کی نواحی میں ان دنوں دس لاکھ سے زیادہ یہودی آباد تھے اور اپنے آپ کو ان یہودیوں کی اولاد بتلاتے تھے جو بابل میں اسیر ہو کر آئے تھے۔ ان دونوں ملکوں کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی تعلقات تھے اور اہلِ یہود ان ملکوں سے تجارت کی خاطر ہندوستان میں آ بسے تھے۔ علاوہ بریں خداوند مسیح کی آمد سے چونسٹھ سال پہلے پومپی (Pompey.) نے یروشلیم کو تباہ کر دیا تھا اور ابن اللہ کی صلیبی موت کے بعد ٹائٹس (Titus.) نے یروشلیم کو فتح کر کے ویران کر دیا تھا۔ سنہ ۱۳۶ء

رومی قیصر ہیڈرین (-Hadrian.) نے وحشیانہ انتقام لے کر یہودیہ کا ستیاناس کر دیا تھا۔ ان پے در پے اور متواتر تباہ کاریوں کی وجہ سے اہل یہود مختلف ممالک خصوصاً عرب اور ہندوستان کی جانب نقل مکانی کر گئے تھے۔

جنوبی ہند کی ریاست کوچین کے یہودیوں میں یہ روایت چلی آتی ہے کہ "جب ہیکل دوسری دفعہ (۷۰ء) میں برباد ہوئی (خدا اس کو جلدی پھر کھڑا کرے) ہمارے آبا و اجداد فاتح کے غضب کے مارے یروشلیم سے نکل پڑے۔ اور مردوں عورتوں، کاہنوں اور یہودیوں کا ایک کثیر گروہ اس مُلک میں آیا۔ اُن میں ایسے اشخاص بھی تھے جو اپنے علم و فضل اور عقل و دانش کے لئے مشہور تھے۔ خدا نے اُن کو اس ملک کے راجہ کی نظر میں عزت بخشی اور اس نے اُن کو کرنگانور عطا کیا تا کہ وہاں وہ بود و باش اختیار کریں ۵۹

جنوبی ہند کے حالات نے بھی قوم یہود کی مساعدت کی۔ پہلی صدی عیسوی میں جنوبی ہندوستان تین ریاستوں میں منقسم تھا۔ اوّل پانڈیا کی ریاست جو مدورا اور ترناولی پر مشتمل تھی۔ دوم چولا اور چیرا کی ریاست جو کوئمبتور اور سیلم پر مشتمل تھی۔ سوم کیرالا کی ریاست جو مالابار پر مشتمل تھی۔ یہ تینوں ریاستیں غیر ملکی تاجروں کو بنظر استحسان دیکھتی تھیں کیونکہ وہ ان کی ریاستوں کی تجارت کے فروغ کا باعث تھے"۔

پس نہایت اغلب ہے کہ پہلی اور دوسری صدی میں یہودی مسیحیوں نے بھی تجارت کی خاطر یا کسی ایذا رسانی سے تنگ آ کر نقل مکانی اختیار کر لی تھی اور ہندوستان آ بسے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہاجر یہودی مسیحی (جن میں مقدس

پنٹینس نے تبلیغی خدمت ادا کی تھی) مقدس برتلمائی رسول کے ذریعہ منجیٔ عالمین پر ایمان لائے تھے اور جب اُنہوں نے نقل مکانی اختیار کی تو اپنے ہمراہ مقدس متی کی انجیل کا ارامی نسخہ ہندوستان لے آئے، جو پنٹینس کے وقت تک اُن کے پاس محفوظ تھا۔

پس مندرجہ بالا قرائن سے ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ دوسری صدی کے آخر میں جنوبی ہند کے کسی گوشہ میں ایک کلیسیا موجود تھی جس کا بیشتر حصہ یہودی مسیحیوں پر مشتمل تھا اور جس میں ہندی نژاد منتشر کار بھی شامل تھے۔ ہندوؤں اور برہمنوں کے سماجی نظام اور اُن کے فلاسفہ کی منطق و حکمت نے ان بیچاروں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ پس اُنہوں نے سکندریہ کی کلیسیا کے پاس وفد بھیج کر وہاں کے چوٹی کے عالم مقدس پنٹینس کو بلوا بھیجا جس نے آکر متزلزل ایمان والوں کے شکوک کا ازالہ کیا اور برہمنوں اور ہندو فلاسفروں کو منطق اور فلسفہ کے ذریعہ دندان شکن جواب دے کر خدا کی نجات کا پیغام سُنایا۔ کلیسیا کو مستحکم کرکے اپنی فصاحت اور بلاغت سے انجیلی حقائق کو سب پہ روشن کیا اور تمام امور کو بدرجہ احسن سرانجام دے کر واپس سکندریہ چلا گیا۔

(۴)

مقدس پنٹینس کی آمد کے سلسلہ میں ایک اور امر قابل غور ہے کہ بشپ یوسیبئس اور مقدس جیروم کے بیانات کے مطابق ۱۹۰ء میں ہندوستانی کلیسیا کی تحویل میں انجیل متی کا ایک قدیم ارامی نسخہ موجود تھا جو مقدس پنٹینس اپنے ہمراہ سکندریہ لے گیا۔ یہ ارامی نسخہ کیا تھا؟ کیا وہ اصل ارامی انجیل متی کی نقل تھی؟ موجودہ انجیل متی کا متن یونانی ہے۔ لیکن کلمۃ اللہ

کی مادری زبان مغربی ارامی تھی (اعمال ۲۶:۱۴ - ۱۰ وغیرہ) جو صدیوں سے ارضِ مقدس میں رائج تھی، اور پہلی صدی مسیحی میں بحر اسود سے ملائی مصر اور ساحل ہند سے ایکلین تک بولی جاتی تھی۔ اس اور دیگر وجوہ کی بنا پر امریکہ کا پروفیسر ٹوری کہتا ہے کہ اناجیل پہلے پہل ارامی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ مقدس پے پیس

-Papias of Hierapolis.

بھی دوسری صدی کے اوائل میں کہتا ہے کہ مقدس "متی نے خداوند کے کلمات کو عبرانی (ارامی) زبان میں لکھا تھا" یہ کلمات مروجہ انجیل متی میں موجود ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ وہ ارامی زبان کے بہترین ادبی معیار پر پورے اترتے ہیں۔ پروفیسر ٹوری کا نظریہ یہ ہے کہ موجودہ یونانی متن اصل ارامی متن کا لفظی ترجمہ ہے اور کہ اس کا ترجمہ کرنے والا "مترجمین کا بادشاہ" ہے۔ جوں جوں کلیسیا میں غیر یہود شامل ہوتے گئے یونانی لفظی ترجمہ زیادہ مقبول ہوتا گیا۔ یروشلیم کے فتح ہونے کے بعد یہودی مسیحیوں کی پراگندگی کی وجہ سے سنہ ۷۰ء کے قریب ارامی اناجیل کنعان سے غائب ہوگئیں اور غیر یہودی کلیسیاؤں کی اکثریت کے باعث ان ارامی اناجیل کی جگہ ان کا یونانی متنِ اناجیل ہر ملک میں نقل ہوکر مہذب دنیا کے ہر گوشہ میں مروج ہوگیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب مقدس برتلمائی رسول نے ہندوستان کے ان مسیحی یہودیوں کے آباؤ اجداد کو بپتسمہ دیا تھا تو آپ نے اُن کو ارامی انجیل متی کا ایک نسخہ بھی عنایت فرمایا تھا تاکہ وہ خداوند مسیح کے واقعاتِ زندگی، صلیبی موت، ظفریاب قیامت اور صعودِ آسمانی کے حالات اور کلمۃ اللہ کے نجات بخش کلماتِ طیبات کی اپنی مادری زبان میں تلاوت کرسکیں۔ دوسری مسیحی صدی کے آخر میں اناجیل کے ارامی نسخے نایاب ہوگئے تھے۔

جب مقدس پینٹینس نے اس نایاب نسخہ کو دیکھا تو اس کا دل خوشی کے مارے بلیوں اچھل پڑا اور اس نے ہندوستان کی کلیسیا سے یہ نایاب نسخہ مانگا تاکہ وہ سکندریہ کے دینیات کے کالج کے کتب خانہ کی زینت ہو ارکانِ کلیسیا نے پینٹینس کی لاجواب خدمات کے عوض میں یہ نایاب نسخہ سکندریہ کی کلیسیا کو دے دیا۔ اُن دنوں روئے زمین پر سکندریہ جیسا کتب خانہ موجود نہ تھا پس مناسب اور موزوں بھی یہی تھا کہ اس قسم کا نایاب نسخہ سکندریہ کی کلیسیا کے دینیات کے کالج میں ہو جو علم و فضل کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھا۔

باب دوم

کلیسیائے ہندوستان اور ایران

فصل اوّل۔ کلیسیائے ایران کی ابتدا

جس طرح مقدس توما رسول کی شہادت کے بعد قریباً ایک صدی سے زاید عرصہ کی نسبت یعنی مقدس پنٹینس کی آمد کے وقت تک ہم کو کلیسیائے ہند کی بابت کچھ پتہ نہیں ملتا۔ اسی طرح اس کے واپس سکندریہ جانے کے بعد ایک صدی تک تاریخ ہندوستانی کلیسیا کی نسبت خاموش ہے۔ جب ایک صدی کے بعد پردہ اُٹھتا ہے تو روشنی دیرپا نہیں رہتی بلکہ بجلی کی کوند کی طرح پھر غائب ہو جاتی ہے۔ اس وقفہ میں ہم کو صرف یہ دکھائی دیتا ہے کہ ہندوستانی کلیسیا کا وجود ہے اور اب اس کا تعلق کلیسیائے ایران کے ساتھ ہے۔

کلیسیائے ایران کا آغاز ایران کی کلیسیا کی بنیاد ملکِ شام کے اُن مسیحی مبلّغین کے ہاتھوں پڑی جو ایڈیسہ[۱] سے

---

[۱] ایڈیسہ (Edessa.) یا اُراہا (Uraha.) موجودہ اُرفہ (Urfa.) کے نام ہیں یہ جگہ شمالی مسوپتامیہ میں دیار بکر سے ۸۰ میل جنوب مغرب کی طرف واقع تھی روایت کے مطابق یہی جگہ حضرت ابراہام کی جائے پیدائش ہے۔ برکت اللہ

آئے تھے جیسا ہم حصۂ اوّل (صفحہ ۲۳) میں بتلا چکے ہیں - روایت اشہر کے مطابق ایڈیسیہ کی کلیسیا کا بانی اڈی تھا، بعض کا خیال ہے کہ تدّی رسول کا دوسرا نام اڈی تھا، بعض کہتے ہیں کہ حضرت اڈی ستر میں سے ایک تھے۔ (لوقا ۱۰: ۱) اس روایت کے مطابق مقدس توما رسول نے خداوند مسیح کی ظفریاب قیامت کے بعد اڈی کو ایڈیسیہ بھیجا۔ اس نے بادشاہ ابگر کو شفا دی اور وہ اپنی رعایا سمیت مسیحی ہو گیا۔ اڈی کے بعد بزرگ اگی اس کا جانشین ہوا جس کو بادشاہ ابگر کے بت پرست جانشین معنو نے گرجا گھر میں ٹانگیں توڑ کر شہید کر دیا۔

اس روایت سے کم از کم یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ایڈیسیہ کی کلیسیا خود مختار تھی اور انطاکیہ کے یا کسی اور ملک یا شہر کے پیٹریارک کے ماتحت نہیں تھی۔ ٹیشین -Tatian. کی مشہور تالیف "مطابقتِ اناجیلِ اربعہ" جس کو ہارمنی ڈیاٹسرون (-Diatessaron or Harmony. کہتے ہیں جس میں اناجیل اربعہ کے الفاظ کو انجیلی الفاظ میں مسلسل طور پر یکجا جمع کیا گیا تھا، اس کلیسیا کا "نیا عہد نامہ" تھا۔

جس زمانہ میں اڈی نے مسیحیت کی اشاعت کی، ایڈیسیہ اوس رہون -Osrhone. کا دار السلطنت تھا اور اس وقت رومی سلطنت میں شامل نہیں تھا۔ قیصر روم نے ۲۱۶ء میں اس کو فتح کر کے بادشاہ ابگر چہارم (Abgar IV.) کو پا بہ زنجیر روم بھیج کر اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا۔ تب سے ایڈیسیہ کی سُریانی کلیسیا کا تعلق انطاکیہ سے ہو گیا اور انطاکیہ کے بشپ سیراپین -Serapion. نے پالوت -Palut. کی تقدیس کر کے اس کو ایڈیسیہ کا بشپ مقرر کیا۔

ایڈیسہ کے دلاور مبلغین اپنے منجی کی انجیل سنانے کے لئے جنوب کی طرف بڑھے اور انہوں نے ایران میں اپنے منجی کا جھنڈا اگاڑا۔ کہتے ہیں کہ پہلا شخص جس نے ایران میں مسیحیت کی بنیاد ڈالی ماری تھا جو ادّی کا شاگرد تھا۔ ایڈیسہ کی کلیسیا نے اس کو سنہ ۸۰ء میں ایران کے شہر سلوکیہ میں بھیجا۔ پس ایڈیسہ کی کلیسیا ایران اور آرمینیا کی کلیسیاؤں کی ماں ہے۔ اس تاریخی تعلق کی وجہ سے ایران کے مسیحی سُریانی زبان میں عبادت کرتے تھے۔ ماری نے سلوکیہ اور ادیابین کے صوبوں میں انجیل جلیل کا پیغام سنایا اور لوگ جوق در جوق مسیحیت کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایڈیسہ سے اور ادیابین کے دارالسلطنت اربیل سے مسیحی مبلغین کے گروہوں کے گروہ نکلے اور یہ مقامات اشاعتِ انجیل کا مرکز ہو گئے جہاں سے ایران کے طول و عرض میں اور دیگر مقامات میں نجات کا پیغام ہر چہار سُو پھیل گیا۔ پہلی صدی کے آخر میں اربیل کے پہلے بشپ پکیدا -Pkidha. کی تقدیس ہوئی۔ ایران کی کلیسیا نے خاص ایڈیسہ میں اپنا ایرانی مدرسۂ دینیات قائم کیا ہوا تھا جس میں ایرانی نوجوان خادمانِ دین تعلیم حاصل کیا کرتے تھے اور کلیسیائے جامع کی روایات کی فضا میں مسیحی زندگی کا سانس لیتے تھے۔

تاریخ ہم کو یہ نہیں بتاتی کہ بشپ ماری کے بعد کون کون بشپ اس کے جانشین ہوئے۔ ان بشپوں کا صدر مقام سلوکیہ طیسفون تھا جو موپوتامیہ میں موجودہ عراق میں ہے۔ اس زمانہ میں یہ علاقہ ایرانی سلطنت کا حصہ تھا اور سلوکیہ طیسفون ایران کی سلطنت کا صدر مقام تھا اور دریائے دجلہ پر موجودہ بغداد سے قریباً بارہ میل نیچے واقع تھا۔

روایت ہے کہ سنہ [illegible]ء میں جب سلوکیہ کا بشپ جیکب بستر مرگ پر تھا تو اس نے

دو پرلیٹوں کو انطاکیہ بھیجا جن کے نام احدابا اور قایم یسوع ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں
رومی اور ایرانی سلطنتوں میں باہمی پرخاش تھی اور انطاکیہ رومی سلطنت کا حصہ
تھا لہٰذا ان دونوں کو ایرانی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا گیا۔ احدابا اُن کے
پنجہ سے بھاگ کر یروشلیم پہنچ گیا۔ لیکن قایم یسوع کو انطاکیہ کے بشپ عليبا
کے ساتھ جس کے ہاں اس نے پناہ لی تھی، مصلوب کر دیا گیا۔ یروشلیم کے
بشپ نے احدابا کی تقدیس کر کے اس کو واپس ایران بھیج دیا اور سیاسی حالات
کو مدنظر رکھ کر مشرقی بشپوں کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک
بشپ کو منتخب کر کے اپنا افسر اعلیٰ مقرر کر لیں۔ بعض لوگ اس واقعہ کو تاریخی خیال کرتے ہیں
لیکن دیگر مورخین اس روایت کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں کیونکہ جیسا ہم سطور بالا
میں ذکر کر چکے ہیں سریانی کلیسیا کا تعلق ۲۱۶ء کے بعد انطاکیہ سے ہوا تھا۔

ایرانی کلیسیا کی ترقی

بہر حال اگرچہ ہمیں ایران کے بشپوں کے
نام معلوم نہیں تاہم اس حقیقت سے انکار
نہیں ہو سکتا کہ پارتھی (Assacids.) سلطنت کے
دنوں میں ایران کے بے شمار افراد مسیحیت کے حلقہ بگوش تھے کیونکہ
پارتھی شہنشاہ کسی خاص مذہب کے خلاف نہیں تھے پس مسیحیت ایران میں
پھلتی پھولتی اور بڑھتی گئی۔ جب ۲۱۶ء میں رومیوں نے ایڈیسہ کو فتح کر لیا
تو وہاں کے مسیحی بھی ایران میں آ کر پناہ گزین ہو گئے اور ایران کی مسیحی کلیسیا
کی تقویت کا باعث بنے۔ ۲۲۶ء میں ساسانی خاندان کے پہلے بادشاہ اردشیر
نے پارتھیا خاندان کے آخری بادشاہ ارتبان کو شکست فاش دی۔ اور
ساسانی خاندان سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ابتدا میں اس خاندان کے
بادشاہ بھی مسیحیت کے خلاف نہیں تھے۔ جس کی وجہ سے پہلی دو صدیوں

میں مسیحیت نے ایران میں اچھی خاصی ترقی کر لی چنانچہ بشپ عبدِ مسیحا کے وقت میں (از سنہ ۱۹۰ء تا سنہ ۲۲۵ء) مسیحیت خلیج فارس سے کردستان کی پہاڑیوں میں پھیل چکی تھی۔ اس کلیسیا میں پچیس بشپ تھے جن میں سے ایک کا صدر مقام بحرِ کیسپین کے قریب تھا۔ ایرانی کلیسیا کے مسیحی سامی نہ تھے بلکہ خالص ایرانی نسل کے تھے جنہوں نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر دیا تھا۔ پس اس زمانہ میں ایران کی کلیسیا نہایت زبردست تھی جس کی وجہ سے ساسانی خاندان کے پہلے بادشاہ اردشیر نے کلیسیا کو ایک الگ مِلّت قرار دے کر مسیحیت کے اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا۔

جغرافیائی حالات کی وجہ سے دریائے فرات کی وادی کی کلیسیا اُن دیگر "مشرقی" کلیسیاؤں سے دور ہو گئی، جو اس سے مغرب کی جانب واقع تھیں۔ دونوں کے درمیان شام کا لق و دق صحرا واقع تھا جس کو عبور کرنا (جیسا قدیم زمانہ میں ذرو بابل، عزرا اور نحمیاہ کو تجربہ ہو چکا تھا) کوئی آسان کام نہ تھا۔ علاوہ ازیں سیاسی طور پر یہ دونوں خطے کسی ایک سلطنت کے ماتحت نہیں تھے، بلکہ مشرقی خطہ ایران کے اور مغربی خطہ رُوم کے ماتحت تھا۔ ان دو وجوہ کے باعث مشرق کی کلیسیاؤں نے ارامی زبان کو (جیسا ہم کہہ چکے ہیں) حسبِ سابق برقرار رکھا لیکن مغربی خطہ کی مشرقی کلیسیاؤں نے یونانی زبان کو اختیار کر لیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ایران کی کلیسیا اپنی قومی اور ملی خصوصیات کے مطابق ترقی کرتی گئی۔

اُن دِنوں کے سیاسی حالات ایسے تھے کہ ایران کے ساسانی

بادشاہ رومی سلطنت سے برسرپیکار رہتے، ان جنگوں میں ایرانی فاتحین رومی سلطنت کی مشرقی حدود کے لوگوں کو قید کر کے ایران لے جایا کرتے تھے۔ ان جنگی قیدیوں کی ایک بڑی تعداد مسیحیوں کی ہوتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی کلیسیا کی تعداد (جو موجودہ ایران کے جنوب مغربی، شمال مغربی اور شمال مشرقی حصوں میں کثرت سے تھی) بیش از بیش دن بدن تعداد میں بڑھتی گئی۔

ایران کا کیتھولی کوس رومی اور ایرانی سلطنتوں کی باہمی خصومت کی وجہ سے ۲۸۰ء میں ایران کا بشپ پاپا جو "مشرق کا اسقف اعظم" کہلاتا تھا کلیسیائے —The Great Metropolitan of the East.

ایران کا کیتھولی کوس[ا] (Catholicos.) بن گیا۔ بشپ پاپا ۳۲۶ء میں فوت ہوا پس نیکایاہ کی کونسل اسی کے عہد میں ہوئی تھی جب اسکو کیتھولی کوس ہوئے چھیالیس سال گذر چکے تھے۔ اس کونسل کے وقت اس کے اقتدار کی عظمت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ کونسل نے نہ صرف اس کو کیتھولی کوس اور اس کی کیتھولی کیٹ کو تسلیم کر لیا بلکہ اس کو بڑی اہمیت دی، اس کونسل کے قوانین چالیس جلدوں میں جمع کئے گئے ہیں جن کے آگے مشرقی کلیسیا سر تسلیم خم کرتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مجموعہ ان قوانین کا ہے جو وقتاً فوقتاً مشرقی کلیسیا نے اپنی مختلف مجالس میں منظور کئے ہیں اور اب وہ تمام کے تمام نیکایاہ کی کونسل کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ در اصل اس کونسل نے صرف بیس قوانین پاس کئے تھے۔ بہرحال مذکورہ بالا ضخیم مجموعہ میں سے ایک قانون کے الفاظ حسب ذیل ہیں :۔

"مشرق کا اسقف اعظم بھی کیتھولی کوس کہلائے گا اور سفارشی دعائیں

[ا] لفظ کیتھولی کوس ایرانی سلطنت کے امور عامہ کے نظم و نسق (—Civil Administration.) میں مستعمل ہوتا تھا یہ افسر صوبہ کا گورنر ہوتا تھا۔ کلیسیائی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بشپ مشرق کی کلیسیاؤں کا افسر اعلیٰ تھا ——— (برکت اللہ)

اس کا نام لیا جائے گا۔ اس کو پیٹریارک کی طرح یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ میٹرو پولی ٹنوں کی تقدیس کرے۔ کلیسیا کی کونسلوں میں وہ تمام میٹرو پولی ٹنوں پر مقدم ہوگا اور اس کا درجہ یروشلیم کے پیٹریارک کے برابر ہوگا" اس کیتھولی کیٹ میں مشرق کے تمام ممالک شامل کر دیئے گئے۔

اگر مندرجہ بالا الفاظ میں نیکایاہ کی کونسل کا اصلی فیصلہ ہے تو یہ ظاہر ہے کہ نیکایاہ کی کونسل نے کیتھولی کیٹ کو قائم نہیں کیا تھا، بلکہ ایک قائم شدہ کیتھولی کیٹ کو اس کی عظمت اور وسعت کی وجہ سے چار و ناچار تسلیم کرکے اس کو ایک ایسا رتبہ دیا تھا جو ایران کی کلیسیائے مشرق کی شان کے شایان تھا۔ نیکایاہ کی کونسل، رومی سلطنت کی حدود میں منعقد ہوئی تھی، لیکن ایران کی کلیسیا نے مشرق رومی سلطنت کی حدود سے باہر تھی۔ پس قیصر روم کانسٹن ٹائن کو یہ اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی سلطنت کے باہر کے ممالک کے بشپوں کو نیکایاہ بلائے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے مشرق کے بشپوں کو دعوت دی اور انھوں نے اس کونسل میں شمولیت اختیار کرکے کلیسیائے جامع کی یگانگت اور جامعیت کو ثابت کر دیا۔

فصلِ دوم

قدیم ایرانی مبلغین اور بشپ

بشپ داؤد کی آمد

پہلا ایرانی بشپ جس کا نام تاریخ ہندوستان سے متعلق کرتی ہے بشپ داؤد ہے[1]۔ یہ بشپ ۲۹۵ء کے قریب بصرہ سے (جو خلیج فارس پر واقع ہے) مبلغ ہو کر ہندوستان آیا وہ علمِ الہٰیات کا بے مثل عالم اور بصرہ کا بشپ تھا۔ جب اس کو یہ احساس ہوا

کہ خدا اس کو ہندوستان میں نجات کا پیغام دینے کی خاطر بلاتا ہے تو اس نے اپنے اسقفی علاقہ کو خیرباد کہا اور ہمارے وطن میں آکر انجیل جلیل کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ بہت لوگ اس کے ذریعہ منجیٔ عالمین کے قدموں میں آکر نجات سے بہرہ ور ہوئے۔ اس بشپ کا صدر مقام غالباً ساحلِ مالابار کے کسی حصہ میں تھا۔

شیومت کا زور اور جنوبی ہند کے مسیحیوں کا ارتداد

چوتھی صدی کے اوائل میں شیومت نے جنوبی ہند میں زور پکڑا۔ ایک شخص مانک داسگر نام چولا کی ریاست (جو مشرقی ساحل پر واقع تھی) میں آیا اور اس نے مشرقی ساحل کے بے شمار مسیحیوں کو راہِ راست سے منحرف کر دیا۔ اس کے بعد وہ خشکی کی راہ سے ۳۱۵ء میں کوئلون (جو ساحلِ مالابار پر واقع ہے) آیا۔ اس زمانہ میں ٹراونکور کے جنوبی حصہ میں کوئلون اور کورنگڑ کے درمیان مسیحی بکثرت آباد تھے۔ اس نے ان کے درمیان رہائش اختیار کی۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ وہ ساتویں صدی میں تھا (دیکھو کتاب کے آخر میں ضمیمہ الف) بہرحال یہ شخص تامل زبان کا زبردست اور نامور شاعر تھا اور شیو کے عشق میں سرشار تھا۔ اس نے شیو کی تعریف میں تامل گیت لکھے ہیں جو آج کل بھی زبان زدِ خاص و عام ہے۔ اس کے گیتوں کی کتاب کا نام "ترؤواشگم" ہے جس کو ہندو مت کے لٹریچر میں وہی جگہ حاصل ہے جو مسیحیوں میں زبور کی کتاب کو حاصل ہے۔ وہ نہایت زبردست لسان اور فصیح البیان شخص تھا اور اس کی فصاحت و بلاغت نے ہزاروں کو مسحور کر رکھا تھا جس کی وجہ سے جنوبی ہند کی کلیسیا اس کو جادوگر کہتی تھی جب کوئی بیمار ہوتا یا مویشیوں میں مری پڑتی تو وہ آکر جھاڑ پھونک کرتا اور گائے کے گوبر کی راکھ چھڑکتا اور لوگوں کو منتر سکھاتا

تھا۔ اُس نے بُدھ مت کی طاقت کو توڑنے کے لئے راہ تیار کی تھی جو نویں صدی میں نہایت تند اور خون ریز آویزش کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی اس شخص نے مسیحیت کے خلاف سخت جہاد شروع کر دیا اور اُس کی لگاتار اَن تھک کوششوں کی وجہ سے کلیسیا کو بہت زک پہنچی۔ اُس نے مسیحیوں کو طرح طرح کی ایذائیں دیں۔ متعدد مسیحی مالابار سے بھاگ کر پانڈیا سلطنت کے ساحل بالخصوص کاویری پٹنم میں جا بسے اور ایک سو ساٹھ خاندانوں میں سے چھیانوے خاندان مُرتد ہو گئے۔ ان مرتدوں کا نام مُنی گرامکر پڑ گیا۔ اور وہ خداوند مسیح سے منہ موڑ کر خدائے واحد کو چھوڑ کر شیو کی پوجا کرنے لگ گئے۔ ان مُرتدوں کی اولاد اب تک کوئلون میں پائی جاتی ہے۔ یہ ایذا رسانی ۲۹۳ء سے ۳۱۵ء تک جاری رہی۔

مالابار کی کلیسیا کی روحانی حالت کی کمزوری کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگ سکتا ہے۔ مقدس توما رسول کی شہادت کو ابھی اڑھائی سو سال نہیں ہوئے تھے کہ کلیسیا کی حالت بگڑ گئی چونکہ ہم کو اس زمانہ کے حالات کا صحیح پتہ نہیں ملتا ہم اس افسوسناک حالت کے اصلی اسباب کو صحیح طور پر معلوم نہیں کر سکتے۔ قیاس یہی چاہتا ہے کہ ہندو مذہب کی فضا اور گرد و پیش کے حالات ایسے تھے کہ اُن دنوں میں کلیسیا نے اپنے تبلیغی فرض کو پورا نہ کیا۔ تبلیغی مساعی ہمیشہ کلیسیا کی رُوح رواں رہی ہیں۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ کلیسیا ان مساعی کے بغیر ارد گرد کے حالات کا شکار ہو کر بے بس اور نیم جان زندگی بسر کرتی ہے، اور بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔

بشپ یوحنا اسقف ایران و ہندوستانِ اعظم

۳۲۵ء میں کلیسیائے جامع کی پہلی عالمگیر کونسل نیکایاہ کے مقام پر منعقد ہوئی جس میں

تمام مسیحی دُنیا سے (جو اُن دنوں میں ہسپانیہ سے لے کر پنجاب تک مشرق و مغرب کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی تھی) تین سو اٹھارہ اسقف جمع ہوئے تاکہ ایریس (-Arius.) کی بدعت پر فتویٰ صادر کریں۔ ایریس سکندریہ کے اسقفی علاقہ کا ایک پریسبٹ تھا، جس کا یہ عقیدہ تھا کہ ابن مخلوق ہے اور وہ ابتدا میں باپ کے ساتھ نہ تھا، اگرچہ کل عالموں سے پیشتر خلق کیا گیا تھا، اور چونکہ اس کی اور باپ کی ایک ذات نہیں لہٰذا وہ خدا نہیں۔ اس بدعت نے تمام مسیحی دُنیا میں ہلچل مچا دی۔ صورتِ حالات ایسی نازک ہو گئی کہ قیصرِ روم کانسٹن ٹائن کو مجبوراً نیکایاہ کی کونسل منعقد کرنی پڑی جس میں ایریس کے خلاف ایک عقیدہ وضع کیا گیا جس کے تحت تین سو اٹھارہ بشپوں نے دستخط کئے ان دستخطوں میں ایک نام ہے جو ہندوستان سے خاص طور پر متعلق ہے اور وہ یہ ہے

Ἰωάννης Πέρσης τῆς ἐν Περσίδι Πάσῃ καὶ μεγάλῃ Ἰνδίᾳ.

یعنی "یوحنا ایرانی اسقفِ ایران و ہندوستانِ اعظم"۔

بعض اصحاب نے "یوحنا ایرانی اسقفِ ایران و ہندوستانِ اعظم" کی تواریخی شخصیت سے انکار کیا ہے، لیکن قیصریہ کا بشپ مورخ یوسی بیس جو خود نیکایاہ کی کونسل میں حاضر تھا کہتا ہے کہ ایران کا بشپ کونسل میں موجود تھا شام کا مائیکل (-Michael the Syrian.) اپنی تاریخ میں بتلاتا ہے کہ ایرانی بشپ یوحنا نیکایاہ کی کونسل میں حاضر تھا ایک اور مغربی شامی (-West Syrian.) یعنی یعقوبی فرقہ (-Jacobite.) کا مشہور مصنف بار صلیبی (Bar Salibi.)

کہتا ہے کہ

"نیکایاہ کی کونسل کے بزرگوں میں ایران کا بشپ یوحنا شامی تھا"

پس کوئی سلیم الطبع شخص بشپ یوحنا کی تاریخی شخصیت سے انکار نہیں کر سکتا بشپ یوحنا کے ذاتی حالات کی نسبت ہم کو ابھی تک اس دستخط کے علاوہ کچھ معلوم نہیں وہ سلوکیہ طیسیفون کے آرچ بشپ اور کیتھولی کوس کے ماتحت تھا جو ان دنوں میں انطاکیہ کے پیٹریارک کے ماتحت تھا۔

بشپ یوحنا کے زمانہ میں سلطنت ایران کی باگ ڈور جیسا ہم اوپر بتلا چکے ہیں ساسانی خاندان کے بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی جب سے سکندر اعظم نے دارا کو شکست دی تھی تب سے ساسانیوں کے وقت تک خالص ایرانی نسل کے بادشاہ تختِ ایران پر نہ بیٹھ سکے تھے۔ ساسانی بادشاہوں کی سلطنت نہایت وسیع اور دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں سے تھی۔ ان کی مملکت (جس میں متعدد بشپوں کے صدر مقام تھے) دریائے سندھ سے فرات تک اور بحرِ ہند سے بحرِ کیسپین اور ہندو کش تک تھی۔ ساسانی خاندان کے زمانہ میں جو خطۂ زمین ایران کی شرقی حدود اور دریائے سندھ کے درمیان اور بحرِ ہند اور افغانستان کی شمالی حدود کے درمیان واقع تھا، اس کو "ہندوستان" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ پس بشپ یوحنا کے اسقفی علاقہ میں پنجاب اور اس کے مغرب کا خطۂ ایران تک شامل تھا جس سے ظاہر ہے کہ نیکایاہ کی کونسل میں پنجاب کی کلیسیا کو بھی نمائندگی حاصل تھی، کیونکہ پنجاب کی کلیسیائیں منظم طور پر "اسقفِ ایران و ہندوستانِ اعظم" کے ماتحت تھیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بشپ یوحنا کا صدر مقام ایران میں غالباً رود رد شہر میں واقع تھا، اگرچہ شہر مرو بھی ۳۳۴ء میں ایک بشپ کا صدر مقام تھا۔

فصل سوم

شاہانِ ایران کی ایذا رسانیاں

ایرانی مسیحی اور مہاجرین کی ہندوستان میں آمد

شاپور اعظم

گو بشپ یوحنا نے خود تاریخ میں کوئی نام پیدا نہیں کیا تاہم اُس کے زمانہ میں ایرانی کلیسیا روحانی جوش سے معمور تھی۔ اُس کو روح القدس کی معموری کی اشد ضرورت بھی تھی کیونکہ اس کا دُنیا کی ایک عظیم ترین سلطنت کے نہایت زبردست بادشاہ شاپور دوم سے پالا پڑا تھا۔ یہ بادشاہ اپنے باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہُوا۔ کہتے ہیں کہ ابھی وہ اپنی ماں کے پیٹ میں تھا کہ مجوسیوں نے اس کی تاج پوشی کی رسم ادا کردی بڑے ہوکر اُس نے فنِ حرب میں ایسا کمال حاصل کیا کہ اس کی فتوحات کی وجہ سے تاریخ میں اُس نے شاپور اعظم کا خطاب پایا ہے۔ وہ زرتشتی مذہب کا پیرو تھا اور اُس کا مذہبی اشتیاق دیوانگی اور جنون کی حد تک پہنچا ہُوا تھا۔ ہم فصلِ دوم میں ذکر کر چکے ہیں کہ دارا کی شکست کے بعد چار صدیوں سے زیادہ عرصہ تک کوئی خالص ایرانی خاندان تختِ ایران پر قابض نہ ہو سکا۔ جب اس طویل عرصہ کے بعد ساسانی خاندان (جو خالص ایرانی نژاد کا تھا) سریر آرائے سلطنت ہُوا تو زرتشتی مذہب کو بھی

اقتدار حاصل ہو گیا اور اُس نے ساسانیوں کے استبداد کے ذریعہ ایسی قوت پکڑی کہ جو ایرانی اس مذہب کو ترک کرکے دوسرا اختیار کرتا وہ باغی متصور ہو کر بے دریغ تلوار کا لقمہ کر دیا جاتا تھا۔ شاپور اعظم نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ زرتشتی مذہب دیگر تمام مذاہب پر غالب ہو جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اُس نے نہ صرف زرتشتی مذہب کی الہامی کتاب اوستا کے متن کو صحیح کروایا بلکہ بُرہانِ شمشیر سے غیر ادیان کے پیرؤوں کو اپنے مذہب کا حلقہ بگوش کرنا چاہا۔ جب اس نے دیکھا کہ مسیحیت دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی جاتی ہے تو اس نے مسیحیت اور کلیسیا پر ایسے ستم ڈھائے کہ الامان والحفیظ۔

رومی اور ایرانی سلطنتوں میں مخاصمت تو پہلے ہی سے چلی آتی تھی لیکن جونہی قیصر روم کانسٹن ٹائن نے مسیحیت کو شاہی مذہب قرار دے دیا ایرانی مسیحیوں کی شامت آگئی۔ اس پر طرہ یہ کہ قیصر روم اپنے آپ کو تمام مسیحیوں کا والی سمجھتا تھا جو ساسانی سلطنت میں رہتے تھے چنانچہ اسی زعم میں اُس نے شاپور کو لکھا کہ "ہم یہ سُن کر خوش ہوئے ہیں کہ آپ کے سایۂ عاطفت میں ہمارے مسیحی بھائی خوش و خرم ہیں اور ہم ان کو آپ کی حفاظت میں سونپتے ہیں"۔ اس خط کو پاکر ایرانی بادشاہ چونک پڑا اور وہ مسیحیوں کو غدّار اور رومی سلطنت کے خفیہ جاسوس تصور کرنے لگ گیا۔ جب دونوں سلطنتوں میں جنگ چھڑی کانسٹن ٹائن بشپوں کو اپنے ہمراہ میدانِ جنگ میں لے گیا تاکہ وہ اس کی فتح کے لئے دُعا کریں۔ نسی بیس Nisibus. شہر کے بشپ جیمس نے بھی اپنے شہر کے لوگوں کو خوب اُبھارا اور انہوں نے ایرانی فوج کا ڈٹ کر جان توڑ مقابلہ کیا۔ ایرانی مسیحیوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ

وہ فوج میں بھرتی نہیں ہوتے اور رومیوں کے خلاف رطنے سے انکار کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان الزاموں میں قدرے صداقت بھی ہو اور بعض مسیحیوں نے پہاڑی وعظ پر عمل کر کے فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا ہو اور بعض رومی قیصر کے (جو اَب مسیحی ہو گیا تھا) خلاف لڑنا نہ چاہتے ہوں۔ اُدھر بشپ جمیس کے اُکسانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ نسی بس شہر نے نہایت کامیابی کے ساتھ شاہ پور کے دو محاصروں کا جان توڑ مقابلہ کر کے ایرانی فوج کے دانت کھٹے کر دیے۔ اس پر شاپور اعظم کی آتش غضب بھڑک اٹھی۔ اُس نے فرمان جاری کیا کہ مسیحی جنگ کے لئے دُگنی ٹیکس ادا کریں اور کیتھولی کوس کو حکم ہوا کہ وہ اس کو جمع کر کے شاہی خزانہ میں داخل کرے۔ مار شمعونؑ نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مسیحی بیچارے اتنی بھاری ٹیکس کے متحمل نہیں ہو سکتے اور اُن سے ٹیکس وصول کرنا میرے منصبی فرائض میں داخل نہیں۔ اس پر اُس کو گرفتار کر لیا گیا اور تمام مسیحی گرجاؤں کو مسمار کر کے شہید کر دیا گیا۔ کیتھولی کوس کو حکم ملا کہ اگر وہ سورج کی پرستش کرے گا تو مسیحی سلامت رہ سکیں گے۔ اُس کے انکار پر فطیری رومی کی عید کے پہلے دن ۳۳۹ء میں وہ پانچ دیگر بشپوں اور کیصد خادمانِ دین کے ساتھ بُری طرح شہید کر دیا گیا۔ جب بادشاہ ان کی شہادت کا تماشا دیکھ رہا تھا تو ایک مسیحی تلوار کو دیکھ کر گھبرا اُٹھا۔ بادشاہ کے گرد رؤسائے سلطنت کھڑے تھے اُن میں سے ایک نے بلند آواز سے کہا "خوف مت کر اے

عـہ لفظ مار کے معنی آقا یا خداوند ہے اور بشپوں کے نام کے پہلے استعمال کیا جاتا ہے جس طرح انگریزی میں لارڈ بشپ کہا جاتا ہے۔

آنکھیں بند کرے اور وہ مسیح کا نور دیکھنے کے لئے کھلیں گی "۔ یہ سن کر بادشاہ غضبناک ہوگیا اور اُس نے اُس وزیر کی زبان حلق کی جانب سے جڑ سے نکلوا دی۔ شاہی فرمان کی رُو سے ایران کی زرتشتی رعایا نے مسیحی کلیسیا پر ایسے جبر و تشدد کئے کہ اُن کے محض تصوّر سے بدن کانپ اُٹھتا ہے۔ شہر سوسا (-Suza.) کے اردگرد کے مسیحی اس عام ایذا رسانی کا پہلا نشانہ بنے اور پھر یہ ایذا رسانی ہر چہار سُو پھیل گئی۔ فرمان کے مطابق صوبہ کے گورنروں اور ہر شہر اور قریہ کے حاکموں اور دیہات کے نمبرداروں تک کو اختیار حاصل تھا کہ وہ جس کو چاہیں گرفتار کرلیں، ہر موبد؎ اور ہر کس و ناکس کو مسیحیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کا اختیار تھا۔ بشپ اور پریسٹ خاص طور پر اُن کا نشانہ بنے۔ مارشمعون کے دو جانشین چھ سال کے اندر شہید کر دیئے گئے اور اُن کی شہادت کے بعد بیس سال تک یہ اسامی خالی رہی جب قیصر جولین (-Julian.) روم کا شہنشاہ ہوا اور مسیحیت شاہی مذہب نہ رہا تو ایران میں بھی چندے آرام ہوگیا۔ لیکن اس کی موت کے بعد جب مسیحیت دوبارہ رومی سلطنت کا شاہی مذہب ہوگیا تو ایران میں نہایت زور شور سے ایذا رسانی شروع ہوگئی۔ جب جولین نے صلح کی شرط کے طور پر پانچ صوبے (جن میں چھ بشپوں کے صدر مقام تھے اور جن میں ہزارہا مسیحی رہتے تھے) شاپور کے حوالے کر دیئے تو شاپور نے مسیحیوں کو اُن جگہوں سے نکال کر ایران کی سرحدوں میں بھیج دیا، اور حکم دیا کہ اگر وہ مسیح کا انکار نہ کریں تو اُن کو قتل کر دیا جائے۔ لاتعداد مسیحی مرد و زن اور بچے اور بیسیوں خادمانِ دین

؎ زرتشتی مذہب کے کاہن موبد کہلاتے ہیں۔ - برکت اللہ

اور بشپ ہلاک کر دیئے گئے"۔

انہی دنوں میں اتفاق سے شاپور کی ملکہ بیمار ہو گئی۔ اس کے طبیب یہودی تھے۔ انہوں نے کہا کہ شہید مار شمعون کی بہن تاربو نے اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کی خاطر آپ پر جادو کر دیا ہے۔ سردار موبد نے اس غریب کو اور دیگر مسیحی عورتوں کو ننگا کر کے کھمبوں کے ساتھ بندھوا دیا۔ ان کے اعضا ایک ایک کر کے کاٹے گئے اور ملکہ کی پالکی کو ان کے لہو لہان گوشت کے پاروں میں سے گزارا گیا۔ اربیل اور ادیابین کے گورنروں اور موبدوں اور بڑے موبد نے اس ایذا رسانی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان صوبوں کے مسیحی بے دریغ تہ تیغ کئے گئے۔ ادیابین کے پادری دانی ایل اور کنواری اُردا (یعنی گلاب کا پھول) کے متعلق لکھا ہے کہ ان کو مسلسل تین ماہ تک ایذائیں ملتی رہیں۔ اُن کے پاؤں میں تیز لوہے کی نوکوں سے سوراخ کئے گئے، پانچ روز تک ان کو سرد برفانی پانی میں رکھا گیا جب اس پر بھی ان کی جان نہ نکلی تو ایذا دینے والوں نے تنگ آ کر اُن کے سر تن سے جُدا کر دیئے جب یہ ایذا رسانی شروع ہوئی تو وہ علاقہ جو اب موجودہ زمانہ میں کردستان، خوزستان اور لورستان پر مشتمل ہے سب کا سب مسیحی علاقہ تھا جس میں بیسیوں بشپ مقیم تھے، اور تقریباً ہر شہر، قریہ، قصبہ اور گاؤں خادمانِ دین کی رہائش گاہ تھا اور مقدس کنواریوں کی تعداد بے شمار تھی۔

سنہ ۳۴۶ء میں مسیحیوں کے خلاف ایک اور فرمان جاری ہوا جس کی رُو سے تمام ایرانی مملکت کے تمام صوبوں میں بے شمار مسیحی مردوں، عورتوں اور بچوں کو شہید کر دیا گیا۔ شاہ پور کے زمانہ کی طویل ایذا رسانی میں سولہ ہزار مشہور اور نامی مسیحیوں کا پتہ چلتا ہے لیکن وہ شہدا، جن کے نام اس دنیا

کی کسی کتاب میں نہیں ملتے" اور صرف "برزہ کی کتاب حیات" میں لکھے ہیں شمار میں لاتعداد ہیں۔

اردشیر

۳۷۹ء میں شاہ پور اعظم مرگیا۔ اس کے بعد اُس کا بھائی اردشیر تخت نشین ہوا، اُس نے چار سال حکومت کی، اس کے عہد میں بھی ایذا رسانی جاری رہی جب وہ مرگیا تو ایرانی کلیسیا کو ۲۷ سال تک قدرے چین نصیب ہوا۔

یزدجردِ اوّل

۴۱۰ء میں یزدجردِ اوّل کے زمانۂ حکومت میں کلیسیائے ایران کی کونسل اور حکومت کے درمیان عہدنامہ ہوا جس کی رُو سے حکومت نے مسیحیوں کو چند حقوق دے دیئے۔ اس وجہ سے زرتشتی موبد اور ایرانی عمائدینِ سلطنت ایسے برافروختہ ہوگئے کہ بادشاہ کا تاج و تخت خطرے میں پڑ گیا۔ لیکن ۲۷ سالہ امن کے دوران میں کلیسیا پھیل کر از سرِ نو ایک نہایت منظم اور زبردست طاقت بن گئی تھی۔ اس عرصہ میں نئے بشپ اور میٹر وپولیٹن تقدیس کئے گئے تھے اور رُوسائے سلطنت میں سے بھی بعض مسیحیت کے حلقہ بگوش ہوگئے تھے۔ یزدجرد حیران تھا کہ کیا کرے، اس نے ان رُوسا کو مسیحیت سے رُوگرداں کرنے کی بہتیری ناکام کوششیں کیں اور موبدوں اور سلطنت کے دوسرے عمائدین کو خوش کرنے کی خاطر کلیسیا کو ایذائیں بھی دیں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مسیحیت ہر طرف پھیلتی گئی۔

بہرام گور

جب یزدجرد ۴۲۰ء میں مرگیا اُس کے جانشین بہرام پنجم یا بہرام گور کے زمانہ میں نہایت خوفناک ایذا رسانی شروع ہوگئی جو تمام ایرانی سلطنت کے گوشہ گوشہ میں جاری تھی۔ اس ایذا رسانی نے پہلی تمام ایذا رسانیوں کو مات کر دیا۔ غریب مسیحیوں کے لئے نت نئی ہولناک ایذائیں ایجاد کی جاتی

تھیں۔ کسی کے ہاتھوں پر سے اور کسی کی پیٹھ پر سے گوشت نوچ لیا جاتا۔ کسی
کے مُنہ پر سے پیشانی سے لے کر ٹھوڑی تک چمڑا اُدھیڑا جاتا۔ ان کے بدنوں کو
لوہے کی کنگھیوں سے کھرچا جاتا، بڑے بڑے گڑھے کھود کر اُن میں چوہے چھوڑ
دیئے جاتے جن کو کئی دن تک بھوکا رکھا جاتا اور پھر مسیحیوں کے ہاتھ پاؤں باندھ
کر اُن کو اُن گڑھوں میں دھکیل دیا جاتا اور چوہے ان بیکس و لاچار شہیدوں
کو آہستہ آہستہ کاٹ کھاتے۔ مسیحیوں کے گھر بار لوٹ لئے جاتے اور اُن کو
آگ لگا دی جاتی۔ اُن کو مُلک بدر کر کے ایسے مقامات میں بھیجا جاتا جو بدامنی
اور خانہ جنگی کے مرکز بنے ہوئے تھے تاکہ وہاں وہ بآسانی قتل کر دیئے جائیں،
اور کسی کو اُن کا پتہ تک نہ چل سکے۔ جو مسیحی روسا اور اُمراء کے طبقہ میں سے
منجیٔ عالمین پر ایمان لاتے تھے اُن کے ساتھ نہایت سختی کی جاتی تھی۔ اُن کا
مال اسباب، گھر بار، جائداد وغیرہ ضبط ہو جاتا اور نقد زر شاہی خزانہ
میں داخل کیا جاتا۔ اُن کے بیوی بچوں پر ناقابلِ برداشت ظلم و ستم روا
رکھے جاتے۔ اُن کو بُری طرح شہید کر دیا جاتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود
اُن کے استقلال میں رتی بھر فرق نہ آتا تھا۔ اُمرائے سلطنت میں سے ایک شخص
فیروز نام رئیس اعظم تھا۔ اُس نے اس قسم کی عقوبت اور عذاب دیکھ کر مسیح کا
انکار کر کے اپنی جان بچالی۔ جب وہ گھر گیا تو اُس کی بیوی اور بوڑھے والدین
نفرت کے مارے اس سے پرے ہٹ گئے۔ اِس پر وہ اُلٹے پاؤں بادشاہ کے
پاس گیا اور مسیح کا اقرار کرنے کے جرم میں بُری طرح شہید ہوا۔ ایک اور
رئیس یعقوب اور پندرہ دیگر اُمرائے سلطنت جو مسیحی تھے گرفتار ہوئے
اُن کا مال و اسباب ضبط کر لیا گیا اور اُن کے درجہ سے گرا کر اُن کو
فیل بان بنا دیا گیا۔ جب موسم گرما آیا تو وہ بادشاہی سڑک کی مرمت

کرنے، جنگلوں کو صاف کرنے، اور پتھروں کو کاٹ کر شاہی راستہ بنانے کے کام پر لگائے گئے۔ جب موبد نے دیکھا کہ اُنھوں نے یہ سب کام مسیح کی خاطر خوشی سے سرانجام دیئے ہیں تو بادشاہ سے اجازت لے کر اس نے اُن کو عقوبت دینی شروع کی۔ وہ ہر شام ایک پہاڑ پر لے جائے جاتے جہاں وہ بھوکے ننگے ہاتھ پاؤں باندھے پڑے رہتے تھے۔ جب اس پر بھی اُنھوں نے سورج کی پوجا کرنے سے انکار کر دیا تو موبد نے حکم دیا کہ اُن کے پاؤں میں رسّے باندھ کر اُن کو پہاڑ کے پتھروں پر گھسیٹا جائے ایسا کہ اُن کا گوشت ہڈیوں سے جُدا ہو جائے لیکن اُن کے بدنوں کی نسیں جو پٹھوں کے سروں پر ہوتی ہیں قائم رہیں۔ لیکن اس رُوح فرسا عذاب کے بعد بھی وہ زندہ رہے۔ یعقوب بادشاہ کے حضور حاضر کیا گیا اور اپنے مسیحی کا انکار نہ کرنے پر بادشاہ نے جھنجھلا کر حکم دیا کہ اُس کو "نو موتوں" سے شہید کیا جائے چنانچہ اُس کے نو اعضا یعنی ہاتھ کی اُنگلیاں، پاؤں کی اُنگلیاں کلائی ٹخنے، بازو، گھٹنے، کان، ناک، یکے بعد دیگرے کاٹ ڈالے گئے۔ اور سب سے آخر میں اُس کا سر تن سے جُدا کر دیا گیا، اس لئے اس شہید کا نام ہی "پارہ پارہ یعقوب" پڑ گیا۔

یزدجرد دُوم

سنہ ۴۲۲ء میں یہ ایذا رسانی گو سرکاری طور پر برائے نام ختم ہو گئی، لیکن درحقیقت بہرام کی سلطنت کے دوران میں وہ ہمیشہ جاری رہی، جب اُس کا بیٹا یزدجرد دوم سنہ ۴۳۸ء میں تخت نشین ہوا تو دس سال تک کلیسیا امن کی حالت میں رہی۔ لیکن اس کے بعد مسیحیوں کو پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر عذاب ملنے لگے، اُن کا قتل عام کیا گیا اور ہر جگہ مسیحی تہ تیغ کئے گئے۔ چنانچہ صرف ایک شہر (موجودہ کرکک) میں

دس بشپ اور ایک لاکھ بتیس ہزار مسیحی شہید کئے گئے۔ بعض مصلوب کئے گئے بعضوں کو سنگسار کیا گیا، اور باقی تلوار سے مارے گئے۔ خادمانِ دین کے لئے خاص طور پر نئی نئی عقوبتیں تجویز کی جاتی تھیں۔ لیکن ان باتوں کے باوجود کلیسیا مسیح کے عشق میں ایسی سرشار تھی کہ ہر ایک کو شہادت کا شوق دامنگیر تھا مرد، عورتیں اور بچے خوشی خوشی مقتل کی جانب جاتے تھے۔ چنانچہ ایک عورت شیرین کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے دونوں بچوں سمیت خندہ پیشانی سے آگے بڑھی، اور بلند آواز سے کہا "ہم بھی مسیحی ہیں ہم کو قتل کرو"۔ اور وہ شہید کر دیئے گئے۔ شاہی افسروں میں سے ایک شخص تُسن جرد نے جب مسیحیوں کا استقلال دیکھا تو اُس نے مان لیا کہ صرف مسیح اس قسم کی دلیری اور استقلال عطا کر سکتا ہے، پس صرف مسیحیت ہی سچا دین ہے اور اس نے بھی مسیحیت کا اقرار کر لیا۔ لیکن اُس کو بپتسمہ پانے کی فرصت نہ دی گئی اور اُس نے اپنے خون ہی میں نہا کر بپتسمہ پایا۔ اس شہید کی یادگار میں جو گرجا گھر بنا تھا وہ تا حال موجود ہے۔ اس جگہ ہر سال ۳۴۴ء کی ہولناک ایذا رسانی کے شہیدوں کی یاد میں ۲۵ ستمبر کے روز کلیسیا جمع ہو کر ایرانی "شہیدوں کی نورانی فوج" کے لئے خدا کی تمجید کرتی ہے۔

ساسانی بادشاہوں کی پے در پے لرزہ خیز اور روح فرسا ایذا رسانیاں ایران کے مسیحیوں کے ایمان کو متزلزل نہ کر سکیں۔ اُن کے ایمان کی شہرت نہ صرف ایران بلکہ اردگرد کے ممالک مثلاً عرب وغیرہ میں صدیوں تک رہی چنانچہ بخاری میں خباب بن ارت سے روایت ہے کہ حضرت محمد نے کہا کہ تم سے پہلے ایسے لوگ تھے کہ اُن کے گوشت ہڈی یا پٹھے تک لوہے کی کنگھی سے نوچے جاتے تھے، لیکن ایسی سختی بھی اُن کو اپنے دین سے نہ پھیر سکی۔ ان

کے گوشت ہڈی یا پٹھے تک لوہے کی کنگھی سے نوچ جاتے تھے لیکن ایسی سختی بھی اُن کو اپنے دین سے نہ پھیر سکی۔ اُن کے سر پر آرہ رکھا جاتا اور اُن کا بدن چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا تھا۔ اس مصیبت میں بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتے تھے۔" (مشارق الانوار نمبر ۱۲۴۶)

ان بہادر مسیحیوں نے موت تک وفادار رہ کر زندگی کے مالک سے زندگی کا تاج حاصل کیا۔

مابعد کی صدیوں میں عرب اور اسلامی تلوار نے زرتشتی مذہب کو ایران سے نابود کر دیا۔ جس مذہب کی تلوار اور دہشت انگیزی نے دنیا کو خائف و ہراساں کر رکھا تھا اب وہ ایک ہزار سال سے سسکیاں بھر رہا ہے۔ خداوند مسیح نے سچ فرمایا ہے کہ "جو تلوار کھینچتے ہیں وہ سب تلوار سے ہلاک کئے جائیں گے" (متی ۲۶: ۵۲) اللہ کی شان ایک زمانہ وہ تھا جب ارمزد کی پرستش دنیا کے بت پرستوں کے تمام دیوتاؤں پر غالب تھی۔ اور یہ عین ممکن تھا کہ یہ مذہب تمام مہذب دنیا پر چھا جاتا کیونکہ ایران نے اسیریا اور بابل کی سلطنتوں کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ ارض مقدس کے یہود ایران کے زیر نگین تھے یا ایرانیوں کے اسیر تھے۔ ایرانی سپاہ نے مصر کی قدیم اور تاریخی مذہبی یادگاروں کو توڑ پھوڑ دیا تھا اور ایرانی سلطنت کے شاہنشاہوں کے فرمانوں کے سامنے ہندوستان، یونان سکندریہ اور مصر کے گردن فرازوں کے سر خم ہوتے تھے اور اگر دارا کو سکندر کے ہاتھوں شکست فاش نصیب نہ ہوتی تو زرتشتی مذہب ادیانِ عالم پر غالب ہو جاتا۔ کجا وہ دن تھے کہ ہزاروں صوبے اور شہر اس کے زیر نگین تھے اور کجا یہ دن کہ کل دنیا میں صرف چند ہزار نفوس اس کے پیرو رہ گئے ہیں۔

سچ ہے ؎

اے زبردست زیردست آزار — گرم تاگے بماند ایں بازار

چونکہ شاپور اعظم اور اس کے جانشینوں کی ایذا رسانیاں مقامی نہ تھیں، بلکہ اُس سیاسی طریق عمل کا نتیجہ تھیں جو تمام ایرانی مملکت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاری تھا، لہٰذا یہ نہایت اغلب ہے کہ پنجاب اور شمال مغربی ہندوستان اور افغانستان وغیرہ ممالک میں (جو اس سلطنت کا حصہ تھے) جو کلیسیائیں مقدس توما رسولِ شہید اور آپ کے جانشین بشپوں نے قایم کی تھیں ان پے درپے کی ایذا رسانیوں کا بھی شکار ہوئی ہوں۔ تاریخ تاحال اس باب میں خاموش ہے اور ہم کو اُن صلیب کے جانبازوں اور مسیح کے جاں نثاروں کے نام معلوم نہیں ہیں جنہوں نے شاہی فرمانوں کی وجہ سے اپنی جانیں قربان کردیں۔ "اور اپنے جامے برہ کے خون میں دھوکر سفید کئے" گو ان کے نام زندگی کی کتاب میں درج ہیں۔

توما اور دیگر مہاجرین کی ہندوستان میں آمد

شاپور اعظم کی ایذا رسانی کی مدت رومی قیاصرہ کی ایذا رسانیوں کی طرح چند ہفتے یا مہینے یا چند سال نہ تھی۔ اس کی ایذا رسانی ۳۴۰ء میں شروع ہوئی اور نہایت تندی سے ۳۷۹ء تک یعنی اس کی موت تک جاری رہی۔ ایران کی کلیسیا کے سامنے اس کے منجی کے ارشاد اور حکم کے الفاظ نہایت واضح اور صاف تھے۔ آپ نے فرمایا تھا:۔

"بھائی کو بھائی قتل کے لئے حوالہ کرے گا، اور بیٹے کو باپ، اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر اُن کو مروا دیں گے۔ اور میرے نام کے باعث سب لوگ

تم سے عداوت رکھیں گے۔ مگر جو آخر تک برداشت کرے گا
وہی نجات پائے گا، لیکن جب تم کو ایک شہر میں ستائیں
تو دوسرے کو بھاگ جاؤ"۔ (متی ۱۰: ۲۱-۲۳)

اس فرمان کے مطابق ایرانی سلطنت کے بعض مسیحیوں نے یہ ٹھان لی کہ کسی ایسے ملک کو نکل جائیں جہاں شاپور کا سکہ نہ چلتا ہو۔ اُن دنوں میں مالابار کی کلیسیا جو چند در چند نہایت پژمردہ حالت میں پڑی تھی۔ کیونکہ ساحلِ مالابار کی ریاستوں کے راجے بت پرستوں کے ایما پر مسیحیوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے۔ پس بے شمار مسیحی ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر ملک کے اندرونی علاقوں میں جا کر پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو کر نیم جان زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب ایران کے مسیحیوں نے جنوبی ہندوستان کی کلیسیا کی افسوسناک حالت کی نسبت سنا اور اپنی ضرورت کی طرف بھی نگاہ کی تو اُن کو یہ احساس ہوا کہ روح القدس اُن کو مالابار کی جانب ہجرت کرنے کی ہدایت کرتا ہے، چنانچہ سلطنتِ ایران کے چار صد مسیحیوں نے ۳۴۵ء میں توما تاجر یروشلیم کی سرکردگی میں ایران سے ہجرت کی اور جنوبی ہندوستان میں آ بسے چونکہ یہ مسیحی مہاجرین مالدار تھے اور تجارت اُن کا ذریعۂ معاش تھا لہٰذا اُس وقت کے راجہ نے مصلحت کو کام میں لا کر بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا اور وہ شاپور کے دستِ تعدی سے محفوظ ہو کر مسیحی اصول کے مطابق زندگی بسر کرنے لگے۔

مالابار کے مسیحیوں کی روایت	جنوبی ہندوستان کی کلیسیا کی تاریخ میں توما تاجر یروشلیم اور ایرانی مہاجرین کی آمد کا واقعہ

نہایت اہم ہے چنانچہ مغربی ساحل کے مسیحیوں میں سینہ بہ سینہ یہ روایت چلی آتی ہے:۔

"جب تک وہ خادمانِ دین جن کا تقرر مقدس تومار رسول نے کیا تھا زندہ رہے سب لوگ مسیحی ایمان کے اصولوں پر چلتے رہے۔ لیکن جب وہ وفات پا گئے تو دین حقہ پر ابتلا کا زمانہ آگیا، اور شادی بیاہ بپتسمہ وغیرہ کی پاک رسوم غیر تقرر یافتہ بزرگوں کے ہاتھوں ادا ہونے لگیں۔ مدّتِ مدید اسی قسم کے بُرے حالات میں گذر گئی۔ اور مُلک غیر مسیحی دستورات اور تعلیم سے بھر گیا۔ جب کوئی اُستادِ الہٰی مکاشفہ کی تعلیم دینے والا نہ رہا تو غیر مسیحی قصّے کہانیاں اور غیر معتبر روایات نے لوگوں میں گھر کر لیا اور مسیحی جادو ٹوٹکہ وغیرہ فضول باتوں پر جو مسیحی ایمان اور اقرار کے خلاف ہیں عمل کرنے لگ گئے۔ صورتِ حالات ایسی بگڑ گئی کہ وہ تہواروں کے دن مندروں میں جاکر پوجا پاٹ کرنے اور بُتوں کو چڑھاوے دینے لگے اس وقت مانک[۵ع] واچکر جادوگر نے شاہی ریاست کے زور اور دنیوی طاقت کے استعمال سے کورومنڈل کے ساحل کے مسیحیوں کو ایذائیں دیں اور بہتوں کو صراطِ مستقیم سے منحرف کر دیا۔ پھر یہ جادوگر مالابار آیا اور اُس نے اپنے جادو کے زور سے کورانگنی میں کوٹر سے لے کر کوئلم تک مسیحیوں کے

۵ع۔ یہ مانک واچکر دراصل مانکتا واسگر ہے جس کا ذکر فصلِ دوم میں آچکا ہے۔

خاندانوں اور چارپایوں میں وبا پھیلا دی اور کہا کہ اگر
مسیحی اس کو بلا کر مقدس راکھ لگائیں گے، اور جادو ٹونے
گنڈے وغیرہ کا استعمال کریں گے اور گئو ماتا کا دودھ مکھن
گھی اور گوبر کھائیں گے تو اُن کے ہاں اولاد ہوگی۔ چونسٹھ ۶۴
خاندانوں نے مسیحی استقلال دکھلا کر ایسی باتیں کرنے سے
صاف انکار کر دیا، لیکن چھیانوے ۹۶ خاندان اس کے جھانسے
میں آ گئے۔ اور خدا کو چھوڑ کر مانک واچکر کے پیرو ہو گئے.....

"مار تو ما رسول کی آمد کے دو سو ترانوے سال بعد یعنی ۳۴۵ء میں
جب کلیسیا کی حالت بد سے بدتر ہو گئی تو خدا نے اس کی بُری حالت پر
ترس کھایا اور ملکِ شام میں اُرہا -Urahai. یعنی
ایڈیسہ کے بشپ نے خواب میں ایک آواز سُنی جو کہتی تھی:-

"کیا تم کو رنج نہیں آتا کہ مالابار کے مسیحی جن کی نجات کی خاطر
میں نے اپنی جان تک قربان کر دی ہے تباہ و برباد اور خستہ
حال ہو رہے ہیں!"

جب بشپ نے یہ آواز سُنی تو وہ یروشلیم کے کیتھولی کوس کے پاس
گیا اور اس کو تمام امور کی اطلاع دی تب کیتھولی کوس نے اپنے تجربہ کار
خادمانِ دین کو فراہم کیا۔ صلاح و مشورہ کے بعد یہ قرار پایا کہ مسیحی تاجر توما
باشندۂ یروشلیم کو حکم دیا جائے کہ وہ خود جا کر مالابار کی کلیسیا کے صحیح حالات
کو دریافت کر کے اطلاع دے۔ جب وہ کرنگانور کی بندرگاہ میں آیا تو اس
نے چند مسیحیوں کو دیکھا جن کی گردنوں میں صلیبیں[۵ع] آویزاں تھیں۔ اُس نے

۵ع یہ امر قابلِ غور ہے کہ یہ صلیبیں سادہ تھیں، اور ان پر مسیح مصلوب کا نقش نہیں تھا۔

اُن سے اُن کی گذشتہ تاریخ، واقعات اور موجودہ حالات معلوم کئے۔
اُس کو یہ احساس ہُوا کہ اِن کو بشپوں اور پریسبٹروں کی سخت ضرورت ہے
کیونکہ خادمانِ دین کے نہ ہونے کی وجہ سے کلیسیا کا حال خستہ اور خراب ہو رہا
ہے۔ اُس نے مرچ اور دیگر اشیا کو خریدا اور اُلٹے پاؤں واپس جا کر کیتھولی
کوس کو تمام حالات پر مطلع کیا۔ اس پر کیتھولی کوس نے اُدراہا کے بشپ
جوزف کو پریسبٹروں اور ڈیکنوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ معزز تاجر
توما کے ساتھ کر دیا۔ اور اُن کے ساتھ بہت مسیحی مردوں اور عورتوں اور
بچوں کو برکت دے کر یہاں بھیجا وہ سب کے سب خدا کے فضل سے ۳۴۵ء
میں مالابار صحیح سلامت پہنچ گئے اور میرپور اور کرنگانور پر اُترے جو ایک
دوسرے کے قریب ہیں۔ کرنگانور موجودہ کوچین بندرگاہ کا نام ہے
"جب توما تاجر کے ہمراہی یہاں پہنچ گئے تو کنا کال یعنی پریور کے خدا پرست
چونسٹھ خاندان ایک جگہ جمع ہُوئے اور باہم صلاح کر کے اُنھوں نے بشپ
جوزف کی اطاعت منظور کر لی۔ بعد ازاں توما تاجر مالابار کے راجہ چیرومان پیرومال[ع]
کو ملنے گیا اور بیش قیمت تحائف اور گراں بہا ہدیے پیش کئے۔ راجہ نہایت
خوش ہُوا اور اُس نے یہ حکم صادر فرمایا۔ "ہم جو اس ملک کے مالک ہیں بخوشی
تمام اُن سب باتوں کو منظور فرماتے ہیں جن کی ہم سے درخواست کی گئی ہے۔
ہم اِس بات پر آفتاب و ماہتاب کو گواہ لاتے ہیں تا کہ جب تک وہ قایم رہیں
ذیل کے حقوق میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہو۔ (اس کے بعد بہتّر حقوق اور
اعزاز کی فہرست ہے جو برہمنوں اور اُونچی ذات کے لوگوں کے لئے مخصوص تھے

ع پیرومال یعنی سردار مالابار کے راجاؤں کا خطاب تھا

اور جن کا ذکر بعد میں آئے گا) ان حقوق کو راجہ نے تانبہ پر کھودنے کا حکم دیا۔ پھر توماکو کوڈنگلر (جہاں مقدس توما رسول نے کلیسیا قایم کی تھی) کا علاقہ بانی اور بیٹوں کے ساتھ عنایت ہوا۔ وہاں اُس نے ایک شہر کی بنا ڈالی اور گرجا گھر بنایا۔ اس نے اس تمام علاقہ کو راجہ کے دشمنوں سے پاک کرکے چیرومان پروال کی رسم "تاجپوشی" ادا کی۔ اور اس کے حضور بیش بہا لعل و جواہرات پیش کئے۔ پس راجہ نے یہ فرمان جاری کیا کہ کوئی شخص تا قیامت ان کا مزاحم نہ ہو۔ اُس نے سترہ ذاتیں ہم کو دیں جو مسیحیوں کے لئے نیچ کام کرتی تھیں۔ مسیحی نہایت خوشی اور خرمی کی زندگی بسر کرنے لگ گئے اگر کسی اُونچی ذات کا شخص (خواہ وہ شاہزادگان یا اُمراء و رؤسا میں سے ہوتا) اُن کو کسی طرح کی تکلیف دیتا تو یہ اٹھارہ ذاتیں جمع ہو کر باہم مشورہ کرکے مزاحمت کرنے والوں کو جو جرمانہ کرتیں وہ اُن کو ادا کرنا پڑتا۔ یہ صورتِ حالات نوسو بیس ۹۲۰ برس تک رہی لیکن اب (۱۸۲۰ء) یہ حال نہیں ہے ....

"اُن مسیحیوں نے جو عزت اور نیک رسوم لے کر ہمارے درمیان آئے تھے ہم کو انجیل کی تعلیم دی اور ہمارے ساتھ شادی بیاہ کئے۔ اعلیٰ اقوام کے لوگوں نے ملکِ شام کے اُن غلاموں کا جن کو وہ اپنے ہمراہ لائے تھے اس ملک کے نیچ ذات والوں کے ساتھ بیاہ کر دیا تاکہ انکی نسل قائم رہے اقوام اعلیٰ نے اپنے لئے ایک ہی نمونہ کے ایک سو گھر شمال کی جانب بنائے اور نیچ اقوام نے دوسرے نمونہ کے بہتر ۷۲ گھر جنوب کی طرف بنائے تاکہ بعد کے زمانہ میں اعلیٰ اور نیچ اقوام میں تمیز ہو سکے۔ یہ دستور بھی مقرر ہوا کہ اعلیٰ اقوام میں وراثت کا حق باپ کی طرف سے اور نیچ

عہ یہ قبضہ اور ملکیت کے نشان تھے۔

اقوام میں ماں کی طرف سے ہو۔ اعلیٰ اقوام کھڑے ہو کر نکاح کروائیں، لیکن پنچ اقوام کا نکاح گھٹنوں کے بل ہوا کرے۔ اعلیٰ اقوام میں دُلھن کی گھونگھٹ تمام بدن پر ہو لیکن پنچ اقوام میں گھونگھٹ صرف کندھوں تک آئے۔ اعلیٰ اقوام سونے اور چاندی کا بیوپار کریں لیکن پنچ اقوام نمک، مچھلی وغیرہ اشیا کی تجارت کریں، یوں اعلیٰ اقوام اور پنچ اقوام کے دستورات میں اختلاف پیدا کر دیا گیا۔ اس شہر کا نام یروشلیم کے نام پر مہادیو پٹنم (یعنی خدائے اکبر کا شہر) رکھا گیا۔ لیکن بعد میں اس کا نام کرنگا نور ہوا ......

"توما تاجر نے بشپ اور پریسٹوں کے ساتھ صلاح و مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ جس خاندان کے آباد اجداد کا مقدس توما رسول نے تقرر کیا تھا اُس کی عزت و وقار کو برقرار رکھا جائے۔ پس غور و فکر کے بعد اُنھوں نے اس خاندان کے بزرگ کو آرچ ڈیکن کے عہدہ پر ممتاز کر دیا۔ پس اس فیصلہ کے مطابق کلیسا میں بشپ ہمیشہ انطاکیہ سے آئے ہیں لیکن آرچ ڈیکن مالابار کے باشندے مقرر ہوتے چلے آئے ہیں۔ یہ صورتِ حالات چار سو اسی برس تک رہی لیکن جب فرنگی (پرتگیز) کوچین کے قلعہ میں آئے تب سے بابا (یعنی بابل کے پیٹریارک) اور بشپ آنے بند ہو گئے"۔ ۹

سُریانی کلیسیا کی روایت سریانی کلیسیا کی تحریرات میں بھی ہم کو ایک روایت ملتی ہے جو کسی یعقوبی ہندوستانی مسیحی نے لکھی ہے۔ یہ روایت تقریباً لفظ بہ لفظ مندرجہ بالا ہندی روایت کے مطابق ہے۔ اس میں لکھا ہے:-

"توما تاجر یروشلیم نے اپنے وطن کو چھوڑا اور اُس بشپ کو اپنے ہمراہ لایا جس نے رویا دیکھی تھی۔ اُس کے ساتھ پریسٹ اور

ڈیکن بھی تھے۔ یروشلیم، بغداد اور نینوا (یعنی موصل) کے
مرد عورتیں اور بچے بھی اس کے ساتھ جہاز میں سوار ہو کر ۳۴۵ء
میں مالابار پہنچے" [۵]

پس ہندی روایت جس کی صحت کا کسی سنجیدہ مزاج نقاد نے انکار نہیں کیا اور شامی روایات دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ۳۴۵ء میں غیر ممالک کے بدیشی مسیحی مالابار میں آکر آباد ہوئے۔ ایران کی تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ شاپور اعظم کی ایذا رسانی اسی زمانہ میں نہایت تند رفتار سے اپنا کام کر رہی تھی پس دونوں قضایا سے ہم اس قدرتی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ظالم بادشاہ شاپور کے ہاتھوں تنگ آکر ایرانی سلطنت کے دولت مند مسیحی توما تاجر یروشلیم اور ایڈیسہ کے بشپ جوزف کی زیر سرکردگی مالابار آکر کرنگانور کی بندرگاہ میں اُترے جس کو موجودہ زمانہ میں کوچین ہاربر Cochin Harbour. کہتے ہیں۔ یہ لوگ سات مختلف قبیلوں سے تھے اور بہتر خاندانوں پر مشتمل تھے۔ اس وقت راجہ چیرومان پیرومال، مالابار پر حکمران تھا اور اس نے مصلحت کو کام میں لا کر بڑے تپاک سے اُن کا خیر مقدم کیا۔ یہ مسیحی نہ صرف متمول تھے بلکہ تاجر پیشہ بھی تھے۔ راجہ نے خیال کیا کہ اُن کی آمد اور رہائش سے اُس کے راج میں تجارت کو فروغ حاصل ہوگا اور اس کی ریاست دولت سے مالامال ہو جائے گی جنوبی ہندوستان کے ہندوؤں کے سماجی نظام میں شمالی ہند کے ویش لوگوں کی طرح کوئی تجارت پیشہ ذات نہ تھی، پس راجہ کی دور بین نگاہوں نے ان پردیسی مسیحیوں کو نہ صرف اپنی مملکت میں پناہ دی بلکہ ہر طرح سے اُن کی دلجوئی کر کے اُن کو آسائشیں بھی عطا کیں۔

مالابار کے مسیحیوں کا منشورِ اعظم

مالابار کی روایت کے مطابق توما

نے راجہ سے درخواست کی کہ اس کو کرنگا نور کی مضافات میں تیرہ سو مربع کول زمین عنایت کی جائے۔ ایک کول بارہ سو انچ کے برابر ہوتا تھا۔ راجہ نے بخوشی تمام مسیحیوں کو دو ہزار نو سو اٹھائیس فٹ زمین عطا کی اور تو ما نے اس پر اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے ایک شہر مہادیو پٹنم یا کرنگا نور بسایا۔ ایک فراخ قطعۂ زمین پر اُس نے ایک نہایت عالی شان گرجا بھی تعمیر کیا جو اُن کی دولت و ثروت کا گواہ اور خدا کا گھر ہونے کی شان کے شایاں تھا۔ راجہ چیرومان پرومال نے مسیحیوں کو ایک پروانہ بھی عطا کیا جو جنوبی ہند کی کلیسیا کی تاریخ میں اُن کا منشورِ اعظم ہے۔ اُس کی رُو سے کلیسیا کو بہتر[۷۲] حقوق اور اعزاز عطا ہوئے۔ ان حقوق میں سے چند حسب ذیل تھے[۲۶]

(۱) تو ما تاجر کو "شہنشاہ کا تاجرِ خاص" کا خطاب ملا۔

(۲) مسیحیوں کو "راجہ" کا خاص نام عطا ہوا۔ غالباً یہ خاص نام "ماپلا" -Mappila. تھا جس کے معنی مسٹر جوزف کے مطابق "داماد" کے ہیں[۲۵]۔ گو سید شمس اللہ قادری کہتے ہیں کہ

"جدید ترین تحقیقات میں اس لفظ کی اصل "مار پلا" ثابت ہوئی ہے جس کے معنی ہیں "منہ بولا فرزند" اور یہ لقب ایسا ہی ہے جیسا کہ شمالی ہند میں راجپوت اور راؤ تھا، جس کے معنی ہیں "راجہ کا فرزند" (ملیبار صفحہ ۳۹)"

یہ لقب دورِ حاضرہ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور ٹراونکور کے ہر مسیحی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نام کے بعد یہ لقب لکھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحیوں کو اُس بلندی پر رکھا گیا جو بادشاہی خاندان کو حاصل تھی

(۳) قیمتی پالکی کے استعمال کی اجازت ملی۔ یہ پالکی ریشم کی رسیوں سے آویزاں ہوتی تھی۔
(۴) روزانہ استعمال کے لئے جو پالکی ہوتی تھی اُس کی اجازت ملی۔
(۵) بساط کا بچھانا۔
(۶) طلائی زنجیر کا استعمال جس کو گلے میں لٹکاتے ہیں۔
(۷) مکھیوں کو اُڑانے کی چوری کا استعمال۔
(۸) مور کے پروں کے پنکھے کا استعمال۔
(۹) عَلَم یا جھنڈے کا استعمال۔
(۱۰) رنگین ریشم کے قیمتی چتر کا استعمال۔
(۱۱) جلوس کے وقت "چلو، چلو، ہٹو، ہٹو" پکارنے کی آواز۔
(۱۲) عورتوں کو نعرے لگانے کی اجازت۔
(۱۳) پانچ قسم کے موسیقی آلات یعنی دو قسم کے ڈھول مہیالی کی شکل کی گھنٹی، جھانج اور ترہی کا استعمال۔
(۱۴) چلنے کے وقت سڑک پر کپڑے کا بچھایا جانا۔
(۱۵) دن کے وقت مشعلوں کا استعمال۔
(۱۶) بڑا چوبی دار آراستہ خیمہ مثلاً جب دولھا دلھن نکاح کے بعد گرجا گھر سے واپس آئیں تو اُن کے لئے آراستہ شامیانے والے شہ نشین کا استعمال۔
(۱۷) نشست گاہ جس کے سامنے شامیانہ ہو۔
(۱۸) عورتوں کے سر کا تاج جو شکل میں پھول اور پنکھے کی مانند ہوتا ہے
(۱۹) نقرئی یا طلائی کمربند کا استعمال۔

(۲۰) کہنی سے کلائی تک کے زیور یا بازوبند۔
(۲۱) عورتوں کے ماتھے کے زیور۔
(۲۲) کہنی سے بغل تک کڑوں کا استعمال۔
(۲۳) کلائی کی زرّیں زنجیر جو صرف جری بہادروں کے لئے مخصوص تھی۔
(۲۴) پازیب یا ٹخنوں کے زیور جو صرف جری شجاعوں کے لئے مخصوص تھے
(۲۵) عورتوں کے پاؤں کے زیور جن سے ٹن ٹن کی آواز نکلتی ہے۔
(۲۶) زری دھاگا یا زنجیر جس کو پٹے کی طرح پہنتے ہیں۔
(۲۷) قرص اور سنکھ کا استعمال۔
(۲۸) دروازوں پر اُٹھا ڈیل۔
(۲۹) تہواروں اور خوشی کے موقعہ پر عارضی محرابی دروازے بنانے کی اجازت۔
(۳۰) دن رات مشعلوں کا جلائے رکھنا۔
(۳۱) دولھا کے سر کے لئے سونے کے تاج کا استعمال۔
(۳۲) ہاتھ یا کلائی کے لئے کڑے۔
(۳۳) طہارت کے پانی کا ہاتھی پر لانا۔
(۳۴) عام زیورات کا استعمال۔
(۳۵) ہاتھی کی سواری کی اجازت۔
(۳۶) باڈی گارڈ کو رکھنے کی اجازت۔
(۳۷) پاؤں میں چپل پہننے کی اجازت وغیرہ۔

مذکورہ بالا حقوق میں سے بعض ہم کو نہایت معمولی قسم کے اور عجیب نظر آتے ہیں لیکن ہر ملک و ہر دور کے ابھی ۱۸۱۸ء کی بات ہے کہ ٹراونکور کی ملکہ

پاربتی بائی نے اپنی ریاست کے نائر لوگوں کو اور چند ذاتوں کو یہ حق دیا تھا کہ وہ سونے چاندی کے زیور سرکار کو فیس ادا کئے بغیر اور سرکار کی خاص منظوری سلئے بغیر پہن سکتے ہیں لیکن یہ حقوق پہلے ہی برہمنوں اور مسیحیوں کو حاصل تھے۔ مندرجہ بالا حقوق جنوبی ہند کی سریانی کلیسیا اپنے بشپوں کے جلوس کے وقت اب بھی استعمال کرتی ہے۔ اور یہ بات راقم الحروف کے اپنے مشاہدہ میں بھی آئی ہے۔

علاوہ ازیں مسیحیوں کو یہ حق بھی دیا گیا کہ ہر گائے کو جس کے پانچ تھن ہوں اپنے قبضہ میں کر لیں۔ یہ حق مالا بار کے بادشاہوں، جاگیرداروں اور سرداروں ہی کو حاصل تھا۔ مسیحیوں کو یہ حق بھی دیا گیا کہ جس سانڈ کے سیدھے یا سُرخ یا نیک فال کے سینگ ہوں اس کو اپنے قبضہ میں کر لیں۔ اگر زمین دریا کے پیچھے ہٹ جانے سے بن جائے تو اس پر قابض ہو جائیں۔ لیکن اب دورِ حاضرہ میں اس قسم کی زمین سرکار کی ملکیت ہو گئی ہے۔ مسیحیوں کو ساگوان کے درختوں کو بھی کاٹنے کا حق حاصل ہوا جو اب بھی بغیر سرکاری اجازت کے کوئی دوسرا شخص کاٹ نہیں سکتا۔ ان کو یہ حق بھی دیا گیا کہ کتوں کے ذریعہ شکار کریں اور جہاں چاہیں مچھلی کا شکار کر لیں۔

علاوہ ازیں مسیحیوں کو یہ حق بھی عطا کیا گیا کہ وہ راجاؤں، شاہزادوں اور سرداروں کی عدالتوں کے ماتحت نہ رہیں۔ وہ مندروں کی عدالتوں کے بھی ماتحت نہیں تھے بلکہ وہ صرف کلیسیائی عدالتوں کے سامنے جواب دہ تھے۔ سریانی مسیحی ہندوؤں کی اعلیٰ ذاتوں مثلاً نائر وغیرہ لوگوں کے گھروں کے اندر آزادی سے آجا سکتے تھے، اُن سے ہم کلام ہو سکتے تھے، اُن کے ساتھ سفر کر سکتے تھے۔ یہ حق دیگر ذاتوں کو حاصل نہ تھا۔

مسیحیوں کو یہ حق بھی دیا گیا کہ وہ اپنے مذہب کا پرچار کریں اور بغیر کسی روک ٹوک کے اپنی دینی رسوم اور مذہبی عبادتوں کو ادا کیا کریں اور جب چاہیں دن کا وقت ہو یا رات کا ہو اپنے تہوار منائیں، خوشی کریں، گھنٹے گھنٹیاں بجائیں، ڈھول پٹوائیں، تُرہی بجوائیں، جلوس نکالیں۔ اور تمام لوگ اُن کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھیں۔

اس کے علاوہ سریانی کلیسیا کے مسیحی اٹھارہ نیچ ذاتوں پر حکمراں بنائے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں بھی خاص اوقات پر نیچ ذات کے لوگ اُن کو مخاطب کرتے وقت "اچن مار" یعنی اٹھارہ ذاتوں کے حکمراں کہتے ہیں۔ یہ نیچ ذاتیں از قسم پاریہ، درزی، آرہ کش، گداگر، پتھر ساز، شراب ساز، ترکھان دھوبی، درختوں پر چڑھنے والے، تاڑ کا عرق نکالنے والے، سنار، لوہار نیام ساز، حجام، بھاٹ گویا شاعر وغیرہ وغیرہ ذاتوں کے لوگ تھے جو ان ذاتوں میں سے مسیحی ہو گئے تھے۔ یہ نیچ ذاتیں خدمت کے لئے اُن کو دی گئی تھیں اور اُن کی خاص حفاظت میں تھیں جس کی وجہ سے دیگر لوگ اُن پر ظلم نہیں کر سکتے تھے۔ یہ حقوق راجہ چرومان پرومال نے ۲۹ ماہ کمبھم سنہ ۳۴۵ء بروز سنیچر چاند کی ساتویں تاریخ کو جب برج سرطان میں تھا ایرانی مہاجرین کو عطا کئے۔

یہ حقوق تانبہ کی دو تختیوں پر کندہ کئے گئے جو سولھویں صدی کے درمیان تک مسیحیوں کے قبضہ میں تھیں۔ سنہ ۱۵۴۴ء میں بشپ مار یعقوب نے دو صد ریال (قریباً یک صد روپیہ) کے عوض اُن کو پرتگیزوں کے پاس گرو کر دیا جنہوں نے ان تختیوں کو غائب کر دیا۔ چنانچہ گووے Gouvea سنہ ۱۵۹۹ء کے قریب اپنی کتاب جارناڈا —Jarnada. میں لکھتا ہے

"توما نے پرومال سے اپنے لئے اور اپنے لوگوں کے لئے متعدد حقوق اور اعزاز حاصل کئے۔ یہ حقوق تانبہ کی تختیوں پر لکھے تھے۔ بشپ مارجیکب نے اس خوف سے کہ مبادا یہ تختیاں گم ہو جائیں اُن کو کوچین کے خزانچی پیرو ڈی سیکیورا

–Pero de Sequeira.

کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اُن کو بحفاظت تمام رکھے اور بوقت ضرورت مسیحیوں کے کام آسکیں۔ وہاں سے وہ لاپروائی کی وجہ سے گم ہو گئیں۔ ان تختیوں کے گم ہو جانے سے مسیحیوں کو بڑا خسارہ ہوا کیونکہ اب اُن کے حقوق پامال ہونے لگ گئے تھے"۔

مالابار کے مسیحی سنہ ۱۵۴۱ء تک ان حقوق کو استعمال کرتے رہے کوچین کا ڈچ گورنر ایڈرین موئنس

–Adrian Moens.

سنہ ۱۷۸۱ء میں لکھتا ہے:۔

"چوتھی صدی میں ایک تاجر توما کرنگانور آیا۔ اس کے ساتھ بغداد موصل اور یروشلیم کے مسیحی اور پریسٹ آئے، اُس نے اپنی دولت کے ذریعہ مقامی حکمرانوں میں بڑا رسوخ حاصل کر لیا، اور مسیحیوں کو بہت حقوق ملے جن کی وجہ سے وہ نہ صرف اونچی ذاتوں میں شمار ہونے لگے بلکہ اُن کا درجہ نائروں سے (جو وہاں کے عمائد اور شرفا تھے) بڑا ہو گیا۔ اُن کو یہ حق دیا گیا کہ تمام سلطنت میں جہاں چاہیں تجارت کریں۔ دکانیں اور کارخانے کھولیں، گرجے بنائیں، اُن کو چند ایسے اعزاز بھی دیئے گئے جو صرف شاہزادگان سے مخصوص تھے۔ یہ شاہی فرمان تانبہ کی دو تختیوں پر کندہ تھا جو مسیحیوں کا منشور اعظم تھا

۱۹۴۴ء میں بشپ مار یعقوب نے مصائب زمانہ کے ہاتھوں تنگ آکر دونوں تختیاں کوچین کے پرتگیزی خزانچی کے پاس چاندی کے دو صد سکوں کے عوض گروی رکھ دیں۔ تب سے یہ تختیاں مالابار سے غائب ہو گئی ہیں۔"

رومن کیتھلک پادری ہوسٹن مرحوم —Fr Hosten. کا خیال ہے کہ "فرانسسکیوں -Franciscans. نے ان دونوں تختیوں کو پرتگال بھیج دیا تھا۔ مار یعقوب ۱۵۴۹ء میں ان کی خانقاہ واقع کوچین میں مر گیا، اور غالباً یہ سنتور اعظم لزبن -Lisbon. میں یا پرتگال کی کسی قدیم خانقاہ میں پڑا ہے۔" ۵۹

اگرچہ یہ تختیاں گم ہو گئی ہیں، ان کی عبارت کا انگریزی ترجمہ ٹراونکور سٹیٹ مینوئل -Travancore State Manual. کی جلد دوم میں موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ ان تانبہ کی تختیوں کی عبارت کی نقل ایک بڑے گرانائٹ کے پتھر (سنگ سرخ) پر کھدوا کر تھرونگا نور کے مندر کے شمالی دروازے پر نصب کی گئی تھی تاکہ ہر کس و ناکس کو اس کا علم ہو جائے۔ لیکن اب یہ پتھر بھی نہیں ملتا۔

فادر ہوسٹن کہتے ہیں کہ ٹراونکور کے دیوان نے ۱۹۲۴ء میں ان کو بتلایا تھا کہ "مالابار کے غیر مسیحی بھی کہتے ہیں کہ قانائی توما کے حقوق ایک پتھر پر لکھے تھے جو ترونچی کلم کے مندر کے قریب نصب تھا۔ جب ٹیپو سلطان نے اس کو دیکھا تو اس نے حکم دیا کہ پتھر کو تہ زمین دبا دیا جائے"۔

(۲)

کہتے ہیں کہ توما مالابار کے راجہ چیرومان پرومال کا وزیر اعظم ہو گیا تھا

لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہاں یہ امر یقینی ہے کہ اس کو شاہی دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا اُس نے راجہ پردمال کو اس کے شاہی تاج کے لئے نہایت قیمتی پتھر تحفہ کے طور پر دیئے۔ اس نے اردگرد کی ریاستوں کے ساتھ جنگ کرنے میں راجہ کی مال و زر سے امداد کی غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کو اس پایہ کے حقوق بھی حاصل ہوئے علاوہ ازیں وہ مختلف اوقات پر دامے درمے راجہ کی امداد کرتا رہا تھا پس اس کو راجہ کے دربار میں اور عام لوگوں میں رسوخ حاصل تھا، چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ راجہ کا دھوبی ایک تاجر کی لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ راجہ نے حکم دیا کہ دونوں کا نکاح ہو جائے بچارے باپ کو چار ناچار راجہ کا حکم ماننا پڑا، لیکن شادی کے موقعہ پر وہ ایسی چال چلا کہ تمام دھوبی چھت تلے آکر مر گئے، تمام اہل حرفہ راجہ کے ڈر کے مارے بھاگ کر لنکا چلے گئے اور راجہ نے توما تاجر کی وساطت سے اُن کو واپس بُلایا۔ اس ایک واقعہ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کا رسوخ دربار اور رعایا دونوں میں کس قدر تھا۔

(۳)

ہر زبردست شخصیت کے نام کے ساتھ روایات و قصص وابستہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ توما تاجر کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی منکوحہ تھی، اور دوسری ایک نائر خواص تھی جو اس کی داشتہ تھی، دونوں سے اُس کے ہاں کافی اولاد ہوئی، پہلی بیوی کی اولاد دریائے کرنگانور سے جنوب کے قطعہ زمین میں بستی تھی۔ اور دوسری کی اولاد شمال کی جانب رہتی تھی۔ پہلی بیوی کی اولاد کا رنگ زیادہ صاف ہے

اور یہ لوگ اپنے شاہی جدِ امجد پر فخر کرتے ہیں لیکن جو شمال میں بستے ہیں وہ رنگ میں زیادہ کالے ہیں۔ پس مالابار کے مسیحی قدیم زمانہ سے دو حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک حصہ کو "شمالی" مسیحی کہتے ہیں اور دوسرے حصہ کو "قانائی" یا "دکھنی" مسیحی کہتے ہیں۔ دونوں گروہ ایک دوسرے کے ساتھ شادی ناطہ نہیں کرتے اور ان کے رسم و رواج اور خد و خال میں بھی فرق ہے۔ منکوحہ بیوی کی اولاد کے لوگ رنگ کے زیادہ صاف ہیں۔ ان کی آنکھیں نیلگوں اور ان کے بالوں کی رنگت بھوری ہوتی ہے گو دونوں حصوں میں بعض ایسے بھی ہیں جن میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ اُن کو اس بات پر ناز ہے کہ وہ توما تاجر کی خالص اولاد ہیں جن کے خون میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں۔ ان دونوں کے بشپ بھی الگ ہیں گو دونوں جماعتیں ایک ہی سریانی کلیسیا کی شریک ہیں۔

(۴)

توما تاجر کا نام جنوبی ہند کی کلیسیا کی تاریخ میں درخشاں ستارے کی مانند چمکتا ہے۔ اس کے نام اور اس کے روشن اور نمایاں کارناموں کی وجہ سے بعض مغربی مصنفین اس غلطی میں پڑ گئے ہیں کہ ہندوستان میں مسیحی کلیسیا کی بنیاد ڈالنے والا مقدس توما رسول شہید نہیں تھا۔ بلکہ یہی توما تاجر تھا لیکن ہم حصہ اول میں ثابت کر چکے ہیں کہ یہ نظریہ سراسر غلط ہے اور مقدس توما رسول ہی نے ہندوستان میں مسیحی کلیسیائیں قائم کی تھیں۔

توما تاجر کو بعض اوقات توما قانائی کہا جاتا ہے۔ اس سے بعض کو یہ گمان ہو گیا ہے کہ یہ توما قانائے گلیل کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ جس

کا ذکر انجیل یوحنا کے دوسرے باب میں آیا ہے۔ لیکن یہ محض خوش فہمی ہے کیونکہ سریانی زبان میں لفظ "قانائی" کے معنی تاجر کے ہیں۔

(۵)

ایرانی مسیحیوں کی ہجرت سے جنوبی ہند کی کلیسیا کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگیا۔ ان کی آمد نے اس نیم جان اور پژمردہ کلیسیا میں نئی جان ڈال دی۔ ان کی جان نثاری اور ان کے ایمان کی ثابت قدمی نے اس لڑکھڑاتی کلیسیا کو پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ اور وہ از سر نو قائم اور اُستوار ہوگئی۔ ایرانی سلطنت کے مسیحیوں کی وفادارانہ جانبازی اور سرفروشی کی مثال نے ہندوستانی مسیحیوں میں نئی روح پھونک دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شکست خوردہ ذہنیت بدل گئی اور اُن کی روحانی زندگی میں بھی نمایاں تبدیلی ہوگئی۔ مسیحی کلیسیا کو ریاست کے سماجی نظام میں ایسا مرتبہ ملا کہ اب تک سولہ سو سال کے طویل عرصہ میں سلطنتِ مغلیہ یا سلطنتِ برطانیہ کے زیر سایہ ہندوستان کے طول و عرض میں کسی مسیحی کلیسیا کو ایسا اقتدار حاصل نہیں ہوا۔

(۶)

ظالم بادشاہ شاپورِ اعظم کی ایذا رسانی کے دنوں میں بشپ شاہ دوست کیتھولی کوس تھا۔ اس نے ۳۴۲ء میں درجۂ شہادت حاصل کیا۔ اس کی شہادت کے بعد دو سال تک اس کی جگہ رہی خالی رہی اور برب٘ع شیمین (-Barb'a Shemin.) کیتھولی کوس مقرر ہوا۔ وہ مشہور و معروف شمعون بار صباعی (-Simon bar Sabae.) کا بھتیجا تھا اور اپنے ایمان کی خاطر فروری ۳۴۵ء

سے ۹ جنوری ۳۴۶ء تک زندان میں رہا اور پھر شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد بیس برس تک (جیسا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں) کوئی شخص کیتھولی کوس مقرر نہ ہوا۔ پس جس کیتھولی کوس کا جنوبی ہند کی روائت ذکر کرتی ہے وہ بر یشیمین تھا جو ۳۴۵ء میں قید تھا۔ لیکن ظالم شاپور کی ایذائیں اور عقوبتیں اس کی مسیحی غیرت اور جوش کو ٹھنڈا نہ کر سکیں اور نہ اس کی ذمہ داری کے احساس کو دبا سکیں۔ گو وہ خود قید زندان میں پڑا تھا وہ مالا بار کی کلیسیا کی حالت کو سنکر رہ نہ سکا اور اس نے توما تاجر کو کہا "میں ان مسیحیوں کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔ اے میرے عزیز بیٹے! مجھے بتلا کہ میں اپنے ان بچوں کی خاطر کیا کر سکتا ہوں۔"

اس نے ایڈیسہ کے بشپ جوزف کو معہ پریسٹوں اور ڈیکنوں کے توما تاجر کے ہمراہ بھیجا۔ اس بشپ کا تبلیغی جوش۔ مسیحی غیرت اور ذمہ داری کا احساس کلیسیائے جامع کے لئے عموماً اور ہندوستانی کلیسیا کے لئے خصوصاً ایک ایسا نمونہ ہے جو تا ابد فروزاں رہے گا۔

(۷)

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ ایرانی مسیحیوں کی اس ہجرت کا اثر مالا بار کی کلیسیا کی دنیاوی اور روحانی زندگی پر پڑا۔ لیکن سب امور سے زیادہ اس ہجرت کا اثر کلیسیا پر یہ ہوا کہ اس کے کلیسیائی تعلقات ایران کی کلیسیا کے ساتھ محکم اور استوار ہو گئے۔ اب سے ہندوستان کی کلیسیا کی آنکھیں مدد کے لئے دیگر کلیسیاؤں مثلاً سکندریہ کی کلیسیا وغیرہ سے ہٹ کر ایران کی جانب لگ گئیں اور ہندوستانی کلیسیا کا نظام ایران کی کلیسیا کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ اس سے پہلے ہندوستان

کے کسی گوشہ کی کلیسیا کا تعلق بذریعہ سکندریہ کی پیٹریارکیٹ کے ساتھ ہوا تھا۔ سکندریہ وہ جگہ تھی جہاں کے باشندے پینٹیکوسٹ کے روز خداوند پر ایمان لائے تھے۔ اب ایران کی کلیسیا کے ذریعہ ہندوستانی کلیسیا کا تعلق انطاکیہ کی پیٹریارکیٹ کے ساتھ ہوا۔ انطاکیہ وہ مقام تھا جہاں منجیٔ عالمین کے پرستاروں کا نام "مسیحی" رکھا گیا تھا۔ بشپ "یوحنا اسقفِ ایران و ہندوستانِ اعظم" کے دستخطوں سے ایران اور ہندوستان کی کلیساؤں کے باہمی تعلق کا پتہ چلتا رہتا۔ لیکن اب ایرانی مہاجرین کی ہجرت کے بعد اس تعلق نے ایک مستقل اور پائدار صورت اختیار کر لی۔ ایران کی کلیسیا ماں بن گئی اور ہندوستان کی کلیسیا اس کی بیٹی ہو گئی۔ اِس وقت سے جنوبی ہند کی کلیسیا کا نام "سریانی" یا "سیرین" کلیسا پڑ گیا۔ اور اب تک اس کے شرکاء سیرین یا سریانی مسیحی کہلاتے ہیں۔

فصل چہارم

بشپ تھیوفلس "ہندی"

چوتھی صدی مسیحی کے درمیان میں جنوبی ہندوستان میں مالابار کی سریانی کلیسیا کے علاوہ ہندوستان کے دیگر مقامات میں بھی غیر معروف کلیسیائیں بستی تھیں۔ جن میں سے ایک کی تاریخ پر چند لمحوں کے لئے پردہ اٹھتا ہے

اور ہم کو ایک مقام میں مسیحیت کا دِیا مدھم طور پر جلتا نظر آتا ہے۔ اس روشنی میں بشپ تھیوفلس جو "ہندی" کہلاتا ہے ۳۵۴ء میں خداوند کی خدمت کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اس "ہندی" بشپ کی کہانی دلچسپ ہے۔ مورخ فلوس ٹورگیس (-Philostorgius.) نے جو ایریس کی بدعت کا پیرو تھا کلیسیا کی تاریخ کو ازابتدائے بدعتِ ایریس تا ۴۲۵ء بارہ جلدوں میں تصنیف کی ہے۔ گو یہ کتاب اب موجود نہیں لیکن اس کا خلاصہ بشپ فوٹی اس (-Photius.) نے تالیف کیا ہے جو راسخ العقیدہ پارٹی کا تھا۔ یہ بشپ فوٹی اس وہی ہے جو ۸۵۳ء میں قسطنطنیہ کا پیٹریارک مقرر ہوا تھا جس کے زمانہ میں مشرقی اور مغربی کلیسیائیں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوگئیں اور اب تک جدا ہیں۔

بشپ فوٹی اس کے خلاصہ سے پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کانسٹن شیئس (-Constantius.) نے جو ایریس کی بدعت کا پیرو تھا ارادہ کیا کہ ایریس کی بدعت کی اپنی سلطنت کے اندر اور بیرونی ممالک میں ہر جگہ اشاعت کرے۔ پس اس نے ۳۵۴ء کے قریب عرب فلکس (یعنی حضر موت اور یمن) میں اس مقصد کی خاطر ایک وفد حمیریوں کی جانب روانہ کیا۔ یہ شہنشاہ اپنی سلطنت کے اُن مسیحیوں کی خاطر جو وہاں براہِ سمندر جاتے تھے، گرجے بنوانا چاہتا تھا۔ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہاں مسیحیت کے قدم جم جائیں۔ پس" اس نے ایک وفد ان لوگوں کے پاس بھیجا جو پہلے صابئین کہلاتے تھے۔ اور جن کا نام اب حمیری ہے تاکہ وہ دین حقہ (یعنی ایریس

کی بدولت، کی طرف رجوع کریں۔"

مرحوم سر سید احمد خطباتِ احمدیہ کے خطبۂ سوم میں کہتے ہیں۔ کہ مذہب صابئین کو " عرب میں قوم سامری نے رواج دیا تھا وہ حضرت شیث اور حضرت حنوک کو نبی مانتے تھے اور اپنے مذہب کو ان کی جانب منسوب کرتے تھے۔ ان کے ہاں ایک کتاب بھی تھی جس کو وہ صحیفۂ شیث کہتے تھے۔ مگر جو برائی کہ آہستہ آہستہ ان کے مذہب میں پھیل گئی تھی وہ یہ تھی کہ وہ ستاروں کی پرستش کرنے لگے تھے۔" مورخ فلوس ٹورگیش کے مطابق حمیری ابراہام اور اس کی بیوی قتورہ کی نسل سے تھے۔ وہ ختنہ کرتے تھے اور سورج چاند اور عرب کی دیویوں کے آگے قربانیاں چڑھاتے تھے۔

شہنشاہ کانسٹن شیئس کے وفد کا سردار تھیوفلس "ہندی" تھا۔ یہ شخص شاہنشاہ کانسٹن ٹائن کے زمانہ میں بحر ہند کے جزائر مالدیو سے روم کو بطور یرغمال بھیجا گیا تھا۔ کیونکہ مالدیو کے قزاق رومی تاجروں کے جہازوں کو جو عرب کے مشرقی ساحل سے براہِ سقوطرہ ہندوستان جایا کرتے تھے لوٹ لیا کرتے تھے۔ پس جس طرح زمانہ حال میں جزائر مالدیو کے سلطان کو کالیکٹ کے کلکٹر کے ذریعہ قابو میں رکھ کر اس پر دباؤ ڈالا جاتا ہے، اسی طرح رومی قیاصرہ بیش ہندی کی خاطر یرغمال لیتے تھے۔ بحری ڈاکوؤں سے محفوظ رہنے کی خاطر مسلح سپاہی جہازوں کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ پلنی[1] کے زمانہ میں جب جہاز ہندوستان کی طرف روانہ ہوتے تھے تو تیر انداز ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ کیونکہ بحری

1. -Pliny.

قزاقوں کا خطرہ سمندر کے تمام خطروں سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا تھا

تھیوفلس روم میں جاکر مسیحی ہوگیا۔ وہ ایریس کی بدعت کا

پیرو تھا۔ نکومیدیا کے ایرین بشپ یوسی بئیس (

Eusebius of Nocomedia.) نے اس کو ڈیکن کے عہدے

پر مامور کیا اور جب وہ وفد کا سردار مقرر ہوا تو بشپ کے عہدہ

پر ممتاز کردیا گیا۔ یہ وفد تحائف لے کر جن میں کپدکیہ کے دوصد

اعلیٰ ترین نسل کے گھوڑے بھی تھے، حمیریوں کے ملک میں پہنچا۔

بشپ تھیوفلس اپنے مقصد میں ایسا کامیاب ہوگیا کہ وہاں کا

سلطان مسیحی ہوگیا۔ اور اس نے اپنی گرہ خاص سے کئی گرجے

تعمیر کئے۔ ایک عالی شان گرجا اس نے دارالسلطنت شہر

تافاران میں بنایا۔ اس شہر اور بادشاہ کے محل کے کھنڈرات جیرم

کے نزدیک اب بھی موجود ہیں۔ بادشاہ نے ایک گرجا عدن میں

بنایا جو رومی تجارت کی منڈی تھی۔ اس نے ایک اور گرجا بحر فارس

کے دہانہ پر بنایا جہاں ایرانی تجارت کی منڈی تھی۔

(۲)

جب بشپ تھیوفلس حمیریوں کے ملک میں کامیابی سے اپنا

مقصد پورا کرچکا تو اس کو اپنا اصلی وطن یاد آیا۔ اور وہ وہاں گیا

مورخ فلوس ٹورگئیس بتلاتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے ہندوستان

کے دیگر حصوں میں گیا اور اس نے وہاں بہت امور کی اصلاح کی

جو درستی سے ادا نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ جب انجیل پڑھی جاتی

تھی تو وہ بیٹھ کر سنا کرتے تھے اور اسی قسم کی دوسری باتیں تھیں

جو الٰہی قانون کے خلاف تھیں۔" رومی عالم بشپ میڈلی کاٹ کا خیال ہے کہ الفاظ "ہندوستان کے دیگر حصص" سے مراد مالابار ہے' جو جزائر مالدیو کے نزدیک ہے۔ مورخ ونسنٹ سمتھ (Vincent Smith.) کہتا ہے کہ "میرے خیال میں ڈاکٹر میڈلی کاٹ کی رائے صحیح ہے کہ تھیوفلس مالابار گیا تھا جہاں اس کو مسیحی ملے"۔ [ملا]

ہر حال تھیوفلس کے بیان سے یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے جس حصہ میں وہ گیا وہاں ایمانداروں کی ایک منظم جماعت موجود تھی۔ جس میں باقاعدہ طور پر عبادتیں ہوتی تھیں اور انجیل جلیل پڑھی جاتی تھی۔ اس کلیسیا میں ایک قبیح دستور یہ تھا کہ جب انجیل پڑھی جاتی تھی تو جماعت بیٹھی رہتی تھی۔ اس بات کی "رسولی ضابطوں" (Apostolic Constitutions.) میں برائی کی گئی ہے کیونکہ وہاں واضح الفاظ میں ہدایت موجود ہے کہ "جب انجیل پڑھی جائے تمام پرسبر ڈیکن اور جماعت کے سب لوگ کھڑے ہو جائیں اور ہر جگہ کامل خاموشی ہو"۔ [ملا]

یہ امر نہایت معنی خیز ہے کہ اسی دستور کی وجہ سے سکندریہ کی کلیسیا کو بھی ملامت کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ چنانچہ مورخ سوزومن لکھتا ہے "سکندریہ کی کلیسیا میں ایک نیا اور قبیح دستور یہ تھا کہ جب اناجیل پڑھی جاتی تھیں تو بشپ کھڑا نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات میں نے کسی اور جگہ نہ دیکھی ہے اور نہ سنی ہے"۔ [ملا] کیا ہم اس دستور سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ یہ ہندوستانی کلیسیا وہی کلیسیا تھی جس کی طرف سکندریہ کا مقدس پنٹینس ڈیڑھ سو سال پہلے گیا تھا۔ اور اس کلیسیا نے سکندریہ

کی کلیسا کے دستور کو اپنا لیا تھا؟ اگر ہمارا یہ قیاس درست ہے تو ظاہر ہے کہ چوتھی صدی کے وسط میں جنوبی ہند میں بعض ایسے مقام بھی تھے جہاں کی مسیحی جماعتیں ابھی تک سریانی کلیسیا کے زیر اثر نہیں تھیں۔

(۳)

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ تھیوفلس کی مساعی جمیلہ سے حمیری اور ان کا سلطان سب کے سب منجی عالمین کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اس نے یمن میں ایسی کلیسیائیں قایم کیں جو اپنے اندر زندگی رکھتی تھیں۔ عرب کے اس گوشہ کی کلیسیا دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی گئی اور ایسی طاقت پکڑ گئی کہ جب پہلے دو سو سال بعد ۵۲۳ء میں اس پر مصیبت کا زمانہ ٹوٹ پڑا تو اس کے شرکا نے سخت ترین ایذا رسانی میں بھی اپنے ایمان پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اس سال ایک متعصب اور عیش پرست شخص ذُو نواس نے تخت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ سر ولیم میور لکھتے ہیں۔ "اس شخص نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس نے نجران کے مسیحیوں پر جنہوں نے یہودیت اختیار کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا سخت ظلم روا رکھے۔ خندقیں کھدوائی گئیں اور ان میں آگ جلا کر مسیحیوں کو زندہ پھینک دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس ایذا رسانی میں کم و بیش بیس ہزار مسیحی تہ تیغ کئے گئے یا زندہ آگ میں جلا دیئے گئے۔ ایک شخص بھاگ کر شہنشاہ جسٹینین (-Justinian) کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور ایک نیم سوختہ انجیل دکھا کر قصاص کا طالب ہوا۔ شہنشاہ کی خواہش کے مطابق ابی سینا یا حبش کے بادشاہ نجاشی (-Negus) نے اس غاصب پر چڑھائی کر کے اس کو شکست دی"[۱۲]

یہ ایذا رسانی ایسی سخت تھی کہ تمام عرب میں اس کا شہرہ ہو گیا۔
اور لوگ پشت در پشت ان عربی مسیحیوں کے ایمان کے استقلال کو
دیکھ کر انگشت بدنداں رہتے تھے۔ چنانچہ ایک سو سال کے بعد قرآن میں
ہم کو ان مسیحی شہداء کی جان نثارانہ وفاداری پر تحسین کی آواز سنائی
دیتی ہے۔ قرآنی سورہ بروج میں لکھا ہے۔"خندقوں والے مارے گئے
وہ ایندھن سے بھری ہوئی آگ تھی۔ جب وہ اس کے پاس بیٹھے تھے۔
اور جو وہ ایمانداروں کے ساتھ کرتے تھے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے
ان ایمانداروں میں صرف یہی ایک عیب پکڑا تھا کہ وہ اس اللہ پر ایمان
لائے تھے جو زبردست قابل تعریف ہے۔ جس کی آسمانوں اور زمین میں
بادشاہت ہے۔ اور اللہ ہر شئے پر قادر ہے۔ جن لوگوں نے ایماندار
مردوں اور ایماندار عورتوں کو ستایا پھر توبہ نہ کی اُن کے لئے دوزخ
کا عذاب ہے۔ اور ان کے لئے جلنے کا عذاب ہے۔" مولوی محمد علی
امیرِ جماعتِ احمدیہ لاہور اپنی انگریزی تفسیر القرآن میں اِن آیات کے
شانِ نزول کی نسبت غالباً بحوالۂ امام فخرالدین رازی لکھتے ہیں "اشہر
ترین یہ ہے۔ کہ یہاں مسیحیوں کی اُس ایذا رسانی کی طرف اشارہ ہے جو
ذونواس شاہِ یمن نے روا رکھی"۔ حدیث میں خود بانیٔ اسلام نے اس
ایذا رسانی کا مفصل حال بیان کر کے ان قرآنی آیات کی تفسیر کر دی ہے
چنانچہ مسلم میں صہیب سے روایت ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ تم سے
آگے ایک بادشاہ ذونواس نام تھا۔ اس کا کاہن ایک شعبدہ باز
جادوگر تھا۔ جب وہ بوڑھا ہو گیا تو اس نے بادشاہ سے عرض کی۔
کہ اب میرے قویٰ میں ضعف آگیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ایک عقیل تیز فہم

جوان مجھے دیدیں تاکہ جو کچھ میں جانتا ہوں اس کو سکھلادوں۔ بادشاہ نے ایک لڑکا اس کے پاس بھیجا اور وہ ساحر بڑے اہتمام کے ساتھ اس کی تعلیم میں مشغول ہوگیا۔ اس لڑکے کی آمد و رفت کی راہ میں حضرت عیسیٰ کے دین کا ایک درویش تھا۔ وہ لڑکا اُس کے پاس بیٹھتا۔ اور اس کا کلام سن کر وہ راہب کے دین پر متدین ہوگیا...... جب بادشاہ کو پتہ لگا تو اس نے غضبناک ہوکر راہب کو بلوا بھیجا۔ جب درویش گرفتار ہوکر آیا تو اس سے کہا گیا کہ تو اپنے دین سے پلٹ جا۔ جب اس نے انکار کیا تو بادشاہ نے ایک آرہ منگوایا اور درویش کی چاند پر رکھا اور اس کو چیر ڈالا یہاں تک کہ وہ دو ٹکڑے ہوگیا۔ ......بادشاہ نے حکم دیا کہ راستوں کے ناکوں پر خندقیں کھدوائی جائیں اور اس نے ان کے اندر خوب آگ بھڑکائی اور حکم دیا کہ جو شخص اپنے دین سے نہ پھرے وہ خندق میں دھکیل دیا جائے۔ بادشاہ کے خادموں نے لوگوں کو بیدھڑک گرفتار کرنا شروع کیا۔ جس شخص کو لاتے وہ لوگ اس سے سوال کرتے۔ اگر وہ اپنے ایمان پر قائم رہتا تو اس کو خندق میں پھینک دیتے۔ ایک عورت آئی جس کے ساتھ ایک لڑکا بھی تھا۔ وہ عورت خندق کی آگ کو دیکھ کر پیچھے ہٹی۔ تب لڑکے نے اس سے کہا۔ اے ماں! تو صبر کر کیونکہ تو دینِ حق پر ہے۔"

(مشارق الانوار مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۳۰ء۔ حدیث ۱۶۱۲۔ صفحہ ۲۰۳ تا ۲۰۶ و اردو ترجمہ تفسیر حسینی جلد دوم ۱۲۱۹ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ)

جب تھیوفلس "ہندی" ہندوستان سے اپنے مشن میں کامیابی حاصل کرکے واپس گیا تو قیصر کانسٹن ٹشئیس اس کی کارکردگی سے نہایت خوش ہوا۔ ۳۵۷ء کے قریب اس شہنشاہ نے سکندریہ کے پوپ مقدس اتھاناسیس کے مقرر کردہ بشپ فرومین ٹشئیس (Frumentius.) کو راسخ العقیدہ ہونے کی وجہ سے ابی سینا کے اسقفی صدر مقام اکسم (Axum.) سے معطل کرکے الگ کردیا۔ اور تھیوفلس کو اس کی شاندار خدمات کی وجہ سے اس کا جانشین مقرر کیا گیا۔ اور وہ ابی سینا کا ایرین بشپ ہوگیا۔

بابِ سُوم

نسطوری کلیسیا اور ہندوستان

آزاد کلیسیائے ایران کی کونسلیں

ہم گذشتہ باب کی فصلِ سوم میں ایرانی بادشاہوں کی ایذا رسانیوں کا حال بتلا چکے ہیں جو ایرانی سلطنت اور رومی سلطنت کی باہمی خصومت اور دشمنی کی وجہ سے شروع ہؤئی تھیں۔ ان ایذا رسانیوں کے بعد جب ایران کی کلیسیا کو امن کا زمانہ دیکھنا نصیب ہوا تو کلیسیا نے اپنا تعلق رومی سلطنت کی کلیسیاؤں سے قطع کر لیا اور وہ ایک آزاد اور خود مختار "کلیسیائے مشرق" بن گئی۔ دارالسلطنت سلوکیہ طیسیفون کا بشپ پہلے ہی کیتھولی کوس تھا۔ اب ایرانی سلطنت نے اس کو کلیسیائے ایران کا خود مختار سر تسلیم کر لیا۔ اور کیتھولی کوس کلیسیا کی وفاداری کا ذمہ دار ہو گیا۔ سنہ ۴۲۴ء میں ایران کی کلیسیا ایک قومی کلیسیا بن کر منظم ہو گئی۔ اگرچہ متعدد غیر مسیحی ایرانی ذی اثر لوگوں نے سلطنت کے اس اقدام کو اچھی نگاہوں سے نہ دیکھا

تاہم ان کی کچھ پیش نہ چلی کیونکہ ایرانی کلیسیا کی خود مختاری کی وجہ سے سمجھدار طبقہ کے شکوک رفع ہو گئے تھے اور اگرچہ اس وقت کے بعد بھی بہرام گور اور یزدجرد دوم کے زمانہ میں کلیسیا کو سخت ترین اور لرزہ خیز ایذائیں اٹھانی پڑیں لیکن منظم ہونے کی وجہ سے اور اپنے ایمان کے استقلال کے باعث ایران کی کلیسیا قائم رہی اور روز افزوں ترقی کرتی گئی۔

چونکہ نیکایاہ کی کونسل رومی سلطنت کی حدود کے اندر منعقد ہوئی تھی اور آزاد ایرانی کلیسیا اُن حدود سے باہر تھی جہاں رومی قیاصرہ کے احکام نہیں چلتے تھے لہذا اس کونسل کے قوانین آئین اور فیصلہ جات ایران اور ایرانی کلیسیا پر عائد نہیں ہو سکتے تھے، تاوقتیکہ ایران کی آزاد اور خود مختار کلیسیا خود اپنی رضا و رغبت سے ان کو قبول کر کے اپنے آپ کو ان کا پابند نہ بنا لے۔ اس مقصد کی خاطر ایران کی خود مختار کلیسیا نے سنہ ۴۱۰ء، سنہ ۴۲۰ء اور سنہ ۴۲۴ء میں اپنی کونسلیں منعقد کیں۔ پہلی کونسل میں "کلیسیائے مشرق" نے اپنے آئین و قوانین وغیرہ وضع کئے اور آخری کونسل یعنی سنہ ۴۲۴ء میں نیکایاہ کی کونسل کے عقاید، آئین و قوانین وغیرہ کو تسلیم کیا اور سرکاری طور پر اعلان ہو گیا کہ ایران کی کلیسیائے مشرق ایک آزاد اور خود مختار کلیسیا ہے جو مغربی ممالک کی کسی کلیسیا کے ماتحت نہیں۔ اس کونسل نے سلوکیہ کے کیتھولی کوس کے لئے باقاعدہ طور پر "پیٹریارک" کا خطاب تجویز کیا۔ اگرچہ اس وقت سے پہلے بھی اس کو عزت کی رُو سے پیٹریارک بلایا جاتا تھا۔ ایران کی ان مشرقی کونسلوں کے طرزِ عمل

نے شاہان ایران پر واضح کر دیا کہ ایران کی مسیحی کلیسیائیں رومی سلطنت کے کسی کونہ کے کسی پیٹریارک یا آرچ بشپ کے ماتحت نہیں اور ان کا قیاصرۂ روم کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں۔

اگرچہ ان کونسلوں کے بعد کے زمانہ میں بھی کلیسیا کو ایران کے زرتشتی بادشاہوں اور موبدوں کے ہاتھوں ایذائیں اٹھانی پڑیں لیکن اب آزاد کلیسیا اپنی تنظیم کی وجہ سے ان کا دلیرانہ مقابلہ کرتی رہی اس کے استقلال کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ کلیسیا نے کتاب مقدس کے مطالعہ کے لئے سکول ہر جگہ کھول رکھے تھے۔ علاوہ ازیں مصر کی کلیسیا کی طرح ایران میں بھی جا بجا خانقاہیں تھیں جن میں راہب درویش اور راہبہ عورتیں ہزاروں کی تعداد میں دعا، عبادت اور روزہ میں شب و روز مصروف رہتی تھیں۔ مسیح کے پرستاران خدا کی محبت کے جذبہ سے معمور اور بنی نوع انسان کی خدمت میں سرشار ہو کر ایثار کی زندگی بسر کر کے مسیحی ایمان کو ہر جگہ زندہ اور تازہ رکھتے تھے۔ اس قسم کی کلیسیا کو کوئی ایذا اور عقوبت فنا نہیں کر سکتی۔ جس نظام اور تنظیم میں ایراقی کلیسیا نے ان کونسلوں میں اپنے آپ کو منسلک کر لیا تھا وہ اسلام کے غلبہ کے زمانہ تک قائم اور برقرار رہا۔

نسطوری کلیسیا کا آغاز

پانچویں صدی میں کلیسیائے جامع میں خداوند مسیح کی شخصیت کے مسئلہ پر بحث چھڑ گئی۔ قسطنطنیہ کے بشپ نیسٹورئیس (Nestorius) نے بی بی مریم صدیقہ کے خطاب "مادرِ خدا" (ΘΕΟΤΟΚΟΣ) پر جو کلیسیا میں رواج

پا گیا تھا اعتراض کیا اور کہا کہ صدیقہ ایک نہایت واجب الاحترام ہستی ہے لیکن اس کو "خدا کی ماں" کہنا جائز نہیں کیونکہ مقدسہ آنخداوند کی انسانی ذات کی وجہ سے ماں تھیں نہ کہ آپ کی الوہیت کی رو سے۔ پس موصوفہ کو "مسیح کی ماں" یا "خداوند کی ماں" کہنا درست اور جائز ہے۔ لیکن آپ کو "خدا کی ماں" کہنا کفر ہے۔ نیسٹورئیس نے عین وقت پہ اور انجیلی رُو سے بجا طور پر اپنی صدائے احتجاج بلند کی کیونکہ چوتھی صدی مسیحی میں مشرکانہ مذاہب کے زیرِ اثر کلیسیا نے بی بی مریم کو "مادرِ خدا" کہنا شروع کر دیا تھا۔ دورِ حاضرہ کے روشن ضمیر انسان اس معاملہ میں بشپ نیسٹوریس کا ساتھ دیں گے۔

لیکن بشپ نیسٹوریس نے اس صدائے احتجاج پر ہی کفایت نہ کی بلکہ وہ اس سے تجاوز کر کے ایک خطرناک بدعت میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے یہ تعلیم دی کہ خداوند مسیح کی انسانیت اور الوہیت دو جدا اور الگ عناصر تھے، ایسا کہ آپ میں نہ صرف دو ذاتیں تھیں بلکہ دو علیحدہ شخصیتیں بھی موجود تھیں۔ چنانچہ کلام یا لوگوس آپ کے انسانی کالبد میں اس طرح بستا تھا کہ گویا آپ کا بدنِ اطہر ایک ہیکل تھا۔ پس آپ میں دو جداگانہ ذاتیں اور دو الگ شخصیتیں تھیں۔ ہر انجیل خواں پر یہ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم کلام اللہ کے مطابق نہیں ہے۔ پس اس بدعتی تعلیم کی وجہ سے ۴۳۱ء میں ایک کونسل بمقام افسس جمع ہوئی جس میں بشپ نسطوریس پر فتویٰ لگایا گیا۔ شاہی حکم کے مطابق اس غریب کو ملک بدر کر دیا گیا اور سالہا سال تک وہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کے حریفوں نے اس کو ہر قسم کی ایذائیں پہنچائیں

اس کی عالمانہ تصنیفات کو آگ کے سپرد کیا گیا۔ اور بالآخر ۴۳۹ء میں وہ
نہایت بیکسی اور لاچاری کی حالت میں جان بحق ہو گیا۔

قیصر روم نے ہر ممکن طور پر کوشش کی کہ نسطوری مذہب پھیلنے نہ پائے
اور بشپ نسطورلیس کے مقلدین کا خاتمہ ہو جائے۔ اس نے اُن تمام
بشپوں کو جو اس کے ہم خیال تھے برطرف کر دیا اور اس کی کوششیں
ایسی بارآور ہوئیں کہ رومی سلطنت میں اس تعلیم کا نام و نشان نہ رہا۔
کیلسیڈن کی کونسل (--Council of Chalcedon.) نے بھی
۴۵۱ء میں نسطوری خیالات کو بدعتی قرار دے کر نسطوریوں کو روم،
قسطنطنیہ، انطاکیہ اور سکندریہ کی کلیساؤں سے خارج کر دیا۔

جب نسطوری مسیحیوں کو رومی سلطنت کے کسی کونے میں جگہ نہ ملی،
تو وہ ایرانی سلطنت کی حدود میں آکر پناہ گزیں ہو گئے۔ چونکہ دونوں
سلطنتوں میں سالہا سال سے دشمنی چلی آتی تھی، ایرانی سلطنت نے
ان بد نصیب نسطوریوں کو اپنا اتحادی سمجھ کر ان کا خیر مقدم کیا کیونکہ
وہ بھی ایرانیوں کی طرح قیصر روم کے جانی دشمن تھے۔ اب نسطوری مسیحی
ایران کے طول و عرض میں پھیل گئے اور شاہ فیروز (-Pheroses.)
نے فرمان دے کر حکم جاری کیا کہ صرف وہی مسیحی ایرانی سلطنت میں رہ سکتے
ہیں جو نسطوری تعلیم کے پیرو ہوں۔ اس فرمان کے رُو سے اُن تمام مسیحیوں
کو نہایت خوفناک طریقوں سے شہید کیا گیا جو راسخ العقیدہ خیالات
کے تھے۔ پس سیاسی حالات کی وجہ سے ایران میں نسطوری مسیحیت کے
قدم جم گئے۔ نسطوری علما اور نسطوری مسیحیوں کی آمد کی وجہ سے ایران
کی کلیسیا کو بڑی تقویت حاصل ہو گئی۔ ایک تو اُن کی تعداد بہت بڑھ گئی

اور دوسرے ان مصیبت زدہ مسیحیوں کے ایمان کے استقلال نے ایرانی کلیسا میں نئی جان ڈال دی اور تمام ایرانی کلیسا نسطوری خیالات کے رنگ میں رنگی گئی۔

ایرانی کلیسا کے نسطوری عقیدہ میں مضبوط ہو جانے کا ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ بشپ ربولس (Rabbulas.) کی وفات کے بعد ۴۳۵ء میں ابس (Ibas.) ایڈیسہ کا بشپ بنا جو نسطوریس کا بڑا حامی تھا۔ افسس کی کونسل میں اس نے بشپ نسطوریس کی حمایت بھی کی تھی۔ بشپ ابس نے تھیوڈور آف موپ سوایسٹیا (Theodore of Mopsuestia.) (جو دراصل نسطوری خیالات کا بانی اور نسطوریس کا استاد تھا) کی کتب کا ترجمہ بھی کیا تھا جس کی وجہ سے ایڈیسہ نسطوری خیالات کا صدر مقام بن گیا۔ اسی سال عالم دینیات بارسوماس (Barsumas.) (جس کو بشپ ربولس نے ایڈیسہ کے مدرسۂ دینیات سے نسطوری ہونے کی وجہ سے نکال دیا تھا) نسی بس (Nisibus.) کا بشپ ہو گیا جہاں اس نے مدرسۂ دینیات جاری کر کے نسطوری خیالات کی اشاعت کی۔ پس اب ایڈیسہ اور نسی بس کے دونوں مدرسے جو مشرق میں علم و فضل کے مرکز تھے نسطوری مذہب کے گڑھ بن گئے یہ حالت نصف صدی تک یعنی ۴۸۹ء تک جاری رہی جب قیصر روم نے ایڈیسہ کا مدرسہ اس بدعت کی وجہ سے بند کر دیا اور نسطوری فضلاء کو وہاں سے ملک بدر کر دیا۔ یہ علماء جہاں کہیں گئے نسطوری خیالات کی اشاعت کرتے گئے اور یوں یہ بدعت روز بروز ترقی پکڑتی گئی

کیونکہ گو رومی سلطنت کے اندر یہ خیالات بدعتی تصور کئے جاتے تھے لیکن اس کی حدود کے باہر لوگ انہی عقاید کو راسخ العقیدہ صحیح مسیحی عقائد شمار کرتے تھے اور ان علما کو حقیقی مسیحیت اور انجیل کے مبلغ سمجھتے تھے۔

بطریقِ بابل یا بطریقِ مشرق

ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۹۸ء میں ایران کے دارالسلطنت سلوکیہ میں ایک کونسل منعقد ہوئی جس میں دریائے فرات کی وادی کے گرد و نواح کے ممالک کی کلیساؤں نے تمام مغربی کلیساؤں سے اپنا تعلق کُلیتہً قطع کر لیا۔ انھوں نے اپنا نام "کلدی مسیحی کلیسیا" رکھ لیا۔ ان کے کیتھولی کوس نے جو مشرقی شام اور ایران کا سر تھا، اپنے لئے "بطریقِ بابل" یا "بطریقِ مشرق"

Patriarch of Babylon or Patriarch of the East.

کا شاندار خطاب تجویز کر لیا۔ اس کا صدر مقام سلوکیہ طیسیفون

—Seleucia-Ctesiphon.

مقرر ہوا۔ یہ شہر درحقیقت دو شہر تھے جو دریائے دجلہ کے مشرقی اور مغربی کناروں پر آمنے سامنے آباد تھے۔ اور موجودہ بغداد سے بارہ میل نیچے واقع تھے۔ اسی واسطے عرب اس کو المدائن کہتے تھے۔ یہ مقام یورپ اور مغربی ایشیا کے ممالک کی تجارت کا مرکز تھا جو وہ ہندوستان اور چین سے کرتے تھے۔ پس تبلیغی مقصد کے لحاظ سے ایران کی یہ دارالسلطنت نکڑ کی جگہ تھی۔ اور پیٹریارک کا صدر مقام ہر پہلو سے نہایت موزوں مقام تھا۔

نسطوری کلیسیا کا عروج

نسطوری بدعت کو قبول کرنے سے پہلے بھی جیسا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں

ایران کی کلیسا نہایت زبردست کلیسا تھی۔ تیسری صدی مسیحی میں اس کلیسیا نے حکمت و فلسفہ اور دینیات وغیرہ میں ایسی حیرت انگیز ترقی کرلی تھی کہ دنیا انگشت بدنداں تھی۔ اس کلیسیا نے افرائیم اعظم (از ۳۰۶ء تا ۳۷۳ء) خمیس بار خردخ۔ اور لیشوع یار نہوہ کا (جو شوا کا ہیڈ دیوبی تن تھا۔) مار نارسے جانزا ور دعار (از ۴۳۶ء تا ۵۰۲ء) جیسی عظیم الشان ہستیاں پیدا کیں۔ ان فضلائے زمانہ کے دنوں میں زبردست مسیحی دارالعلوم وجود میں آئے جن میں نسیبن (Nsebun.) الفاکیہ سلک طسپن (Salak-Thispan.) اور سکندریہ کے دارالعلوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ خانقاہوں میں مبلغین تیار کئے جاتے تھے چنانچہ صرف اوگن (Awgin.) (تاریخ وفات ۳۶۳ء) کی ایک خانقاہ سے بہتر مشنری وقتاً فوقتاً مختلف مقامات کو چلے گئے رہے۔ چوتھی صدی کے خاتمہ سے پہلے مسوپوتامیہ میں دو اور خانقاہیں قائم ہو چکی تھیں۔

جیسا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں ایرانی بادشاہ کبھی مسیحی کلیساؤں کو ایذائیں دیتے تھے۔ اور کبھی اس کو بنظر عنایت دیکھتے تھے۔ مورخ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان بادشاہوں کی ایذا رسانیاں کلیسیا کے حق میں زیادہ مضر ثابت ہوئیں، یا ان کی نظر عنایت نے اس کو زیادہ نقصان پہنچایا۔ جب کبھی شاہانِ ایران کلیسیا کے ساتھ رواداری اور مصالحت کا سلوک کرتے تھے، وہ اس امر کی خاص احتیاط رکھتے تھے کہ کلیسیا کا کیتھولی کوس اور پیٹریارک ایسا شخص ہو جو اُن کے اشاروں پر چلے۔ جب کبھی کوئی پیٹریارک سرتابی کرنے کی جرأت کرتا تھا وہ اُس کو اس کے عہدے سے معطل کر دیتے تھے۔

جب کبھی زرتشتی موبد بادشاہ کے مزاج پر غالب آجاتے تھے کلیسیا کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ سنہ ۶۱۰ء میں جب ساسانی سلطنت دم توڑ رہی تھی تب اس نازک حالت میں بھی اس نے کلیسیا کو ایذائیں دیں اور بیس سال تک پیٹریارک کی اسامی خالی رہی۔ لیکن ان بار بار کی ایذا رسانیوں کے باوجود مسیحیت ہر چہار سُو پھیلتی گئی۔ اور ایرانی امرا، شرفا اور عمائدینِ سلطنت بھی مسیحیت کے حلقہ بگوش ہوتے رہے۔ پانچویں صدی میں ایرانی کلیسیا ایسی طاقت ور تھی کہ مرکزی ایشیا کے مشہور مقامات مَرو اور ہرات بشپوں کے صدر مقام ہوگئے۔ قوم ہن (—Huns.) اور ترک مسیحی ہوگئے۔ وہاں سے مسیحیت مشرق کی جانب بڑھتی گئی اور ساتویں صدی میں چین میں پھیل گئی اگرچہ اس صدی میں سنہ ۶۲۵ء تک پیٹریارک کی اسامی خالی رہی تھی۔ اس سال یسوع یابس (—Jesu Jabas.) پیٹریارک ہوا۔ اسی پیٹریارک کے عہد میں سنہ ۶۵۱ء میں اسلام نے ساسانی خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ اس پیٹریارک نے مسلمانوں کو جزیہ دے کر کلیسیا کی حفاظت اور مذہبی آزادی کی مراعات حاصل کر لیں۔ حضرت عمر نے جزیہ معاف کر دیا۔ اور حضرت علی بن ابی طالب نے ان مراعات پر مہر تصدیق کر کے ایک فرمان میں مسیحیت کی تعریف بھی کی۔ کیونکہ یہ خلفا بھی ساسانی بادشاہوں کی طرح نسطوری کلیسیا کو رومی سلطنت کا دشمن سمجھ کر اپنا اتحادی شمار کرتے تھے جب سنہ ۷۶۲ء میں خلفا نے بغداد کو دارالخلافہ بنایا تو نسطوری پیٹریارک نے بھی اپنا صدر مقام وہیں بنا لیا اور جب تک خلافت قائم رہی بغداد بطریق بابل کا صدر مقام رہا۔ کیونکہ ان دنوں میں بغداد مغرب و مشرق کے ممالک

کی تجارت کا مرکز تھا جس طرح سلوکیہ ساسانی بادشاہوں کے زمانہ میں مرکز تھا جس طرح ان کے زمانہ میں سلوکیہ تبلیغی لحاظ سے نکڑ کی جگہ تی اسی طرح خلفا کے زمانہ میں نسطوری کلیسیا نے بغداد کی تجارتی راہوں سے پورا فائدہ اٹھا کر اپنے مبلغین کو مرکزی ایشیا۔ شمالی ہندوستان۔ جنوبی ہندوستان اور چین کے مختلف مقامات میں دُور دُور بھیج دیا۔

اسلامی عہدِ خلافت میں اکثر اوقات نسطوری کلیسیا کو بری طرح ستایا گیا اور اس کو بسا اوقات ستم اور استبداد ظلم اور تعدی اور ایذا کے زمانے دیکھنے پڑے۔ کبھی خلیفۂ وقت مسیحیوں پر ستم ڈھاتا۔ کبھی مسیحی تاجروں کی دولت کے سبب کسی والی کے دندانِ حرص تیز ہو جاتے۔ کبھی مذہبی جنون ان کا ناک میں دم کر دیتا۔ کبھی کوئی مفتی اور قاضی رشک اور تعصب کے مارے ان کا قافیہ تنگ کر دیتا۔ عامتہ المسلمین ہر وقت ان کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اگرچہ اسلامی حکمران ایرانی مسیحیوں کے اس قدر مخالف نہیں تھے جتنا عربی مسیحیوں کے جان لیوا تھے تاہم نہ صرف ایرانی مسیحیوں کی جائدادیں ضبط کی جاتیں بلکہ مسیحیت کی اشاعت کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں۔ لیکن بعض خلفائے عباسیہ ایسے بھی تھے جنھوں نے مسیحیوں کو نہ صرف پناہ دی بلکہ ان کو اپنا منظور نظر بھی بنایا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یہ خلفا مسیحیت کے شیدائی تھے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ دنیا بھر میں تجارت اور علم و فضل کے لحاظ سے مسیحیوں کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ان کے مدرسوں میں جو ایڈیسہ۔ نسی بس۔ سلوکیہ اور ڈورکینہ (Dorkena) میں تھے کلدی۔ شامی اور یونانی زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ علومِ ریاضی و ہندسہ۔ صرف و نحو۔ موسیقی۔ علم ہیئت

نقشہ ایشیا
روس
جھیل بالکش
چین
بحر جاپان
مصر
سیام
برما
بورنیو
میلوں کا پیمانہ
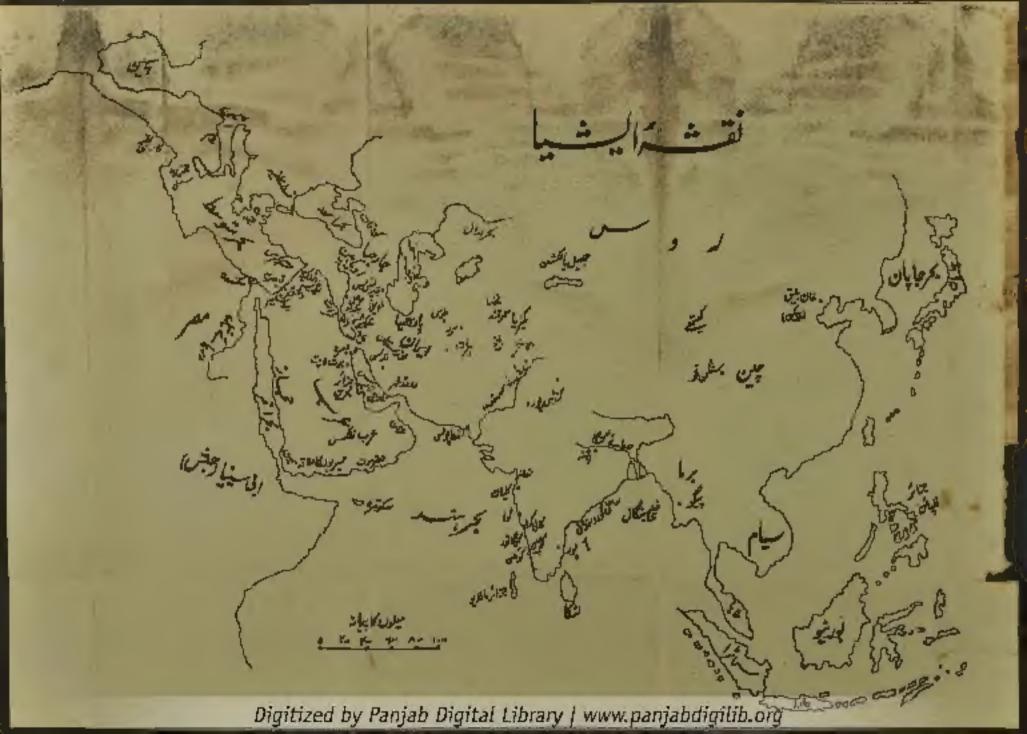
ونجوم، شعر وسخن، خطابت ولسانی، منطق، فلسفہ اور طب کے ماہر تھے۔ ان کی تصنیفات کے خزانے پبلک لائبریریوں اور کتب خانوں میں رکھے جاتے تھے خلفائے عباسیہ کے حکم کے مطابق نسطوری علما نے ان کتابوں کے کلدی سُریانی۔ یونانی اور دیگر زبانوں سے عربی میں ترجمے کئے۔ انھوں نے دیگر کلدی ایرانی اور مصری تصنیفات کے علاوہ ارسطو اور جالینوس کی تصنیفات کے ترجمے کرکے ہارون رشید اور دیگر علم دوست خلفا کے زمانہ کو "اسلام کا سنہری زمانہ" بنا دیا۔ اور آج اسلامی دنیا جس زمانہ پر فخر کرتی ہے وہ محض نسطوری مسیحیوں کے طفیل سے وجود میں آیا تھا۔

اس آٹھ سو سال کے عرصہ میں خلفائے اسلام کی عداوت، صوبوں کے گورنروں اور دیگر حکمرانوں کے مظالم کے باوجود نسطوری کلیسیا کا تبلیغی جوش ترقی کرتا گیا۔ مورخ گبن ہم کو بتلاتا ہے کہ "خلفا کے زمانہ میں نسطوری کلیسیا چین سے یروشلیم اور کپرس تک پھیلی ہوئی تھی اور ان کی اور یعقوبی (Jacobite.) مسیحیوں کی تعداد رومی اور دیگر کلیساؤں سے شمار میں بہت زیادہ تھی۔" ان ایام میں جب رومی کلیسیا اپنے تبلیغی فرض کو بھول چکی تھی اور عزلت کی حالت میں نجات کی تلاش کرکے رہبانیت کے گوشہ میں سست پڑی تھی، یہ نسطوری کلیسیا باوجود بدعتی ہونے کے اپنے خداوند اور منجی کے پیغام کو پیش نظر رکھ کر براعظم ایشیا کے مختلف ممالک کے باشندوں کو نجات کا پیغام سنانے اور اقوام وملل کو منجیٔ عالمین کے قدموں میں لانے میں ہمہ تن مصروف تھی۔ اس فرض کے سرانجام دینے میں اس کلیسیا کے مبلغین نے ایشیا کے دُور و دراز فاصلوں کو طے کرنے میں ذرا باک نہ کیا۔ وہ سفر کی اذیتوں کو خاطر میں بھی نہ لائے اور بے شمار مصیبتوں

اور رکاوٹوں کا سامنا کرکے انھوں نے موت کے خطروں کی پروا نہ کی۔
تمام مرکزی۔ جنوبی اور مشرقی ایشیا کے ممالک ان کے سامنے تھے۔ تو ان کے
وحشیوں نے (جن کی نسلوں نے یورپ کو تہ وبالا کر دیا) انجیل جلیل کو قبول
کریں۔ سلطنت ایران کے بکتریوں۔ مادیوں۔ ایلامیوں اور کردوں نے
نجات کا پیغام صلیب کے ان علمبرداروں سے سنا۔ سلطنت چین کے لوگ
اور جاپان کے باشندے نسطوری مبلغین کے ذریعہ مشرف بہ مسیحیت ہو گئے
بالخصوص پیٹریارک ٹموتھی سے ۷۷۸ء اور ۸۲۰ء کے درمیان بے شمار
مبلغین کو ایشیا کے مختلف ممالک کو روانہ کیا۔ ان میں سے دو مبلغین کاردگ
(-Cardag.) اور جبداللہ (-Jabdallaha.)
تبلیغی مساعی میں ایسے کامیاب ثابت ہوئے کہ ان کو اسقف کے عہدہ
پر ممتاز کرکے واپس بھیج دیا گیا اور ان کو ہدایت کی گئی کہ اگر کسی دور دراز
ملک میں کسی اور بشپ کو تقدیس کرنے کی ضرورت لاحق ہو تو وہ دونوں
تقدیس کرتے وقت انجیل جلیل کا ایک نسخہ درمیان میں رکھ کر اس کو تیسرا
بشپ تصور کرکے نئے بشپ کی تقدیس کر دیں۔

ایک شخص داؤد نام چین کا بشپ مقرر کیا گیا۔ نویں صدی میں جب
عرب سیاح ابن وہاب چین آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ شہنشاہ چین کے
دربار میں خداوند مسیح اور دوازدہ رسولوں کی شبیہ مبارک موجود تھیں۔
اور شہنشاہ چین مسیحیت سے بخوبی واقف تھا اور جانتا تھا کہ خداوند مسیح
نے تیس ماہ تک دنیا میں انجیل کا پیغام سنایا تھا۔ سنگن فو کا مشہور
چینی کتبہ اس تبلیغ کا گواہ ہے۔ اس لوح کا کتبہ ایک چینی مسیحی کنگ سنگ
(-King-Tsing.) نے جو سریانی کلیسیا کا پریسیٹ

تھا ٹکسالی چینی زبان میں لکھا ہے۔ اس کتبہ کی اصطلاحات سے ظاہر ہے کہ مسیحی ہونے سے پہلے وہ بدھ مذہب کا ایک فاضل عالم تھا۔ اس پتھر کی لوح پر (جو ۹ فٹ اونچی اور تین فٹ چوڑی ہے) مسیحی اصول لکھے ہیں۔ اور ذیل کے تواریخی واقعات درج ہیں "شہنشاہ تلئے شنگ (-Tae-Tsung.) کے زمانہ میں نیک نہاد پادری ملک شام سے آئے۔ ۶۳۵ء میں وہ چنگ گنگ (-Chang-gang.) آئے۔ مقدس نوشتوں کا ترجمہ شہنشاہ کے کتب خانہ میں رکھا گیا۔ اور وہ خلوت میں مسیحیت کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ تب اس نے اس کی اشاعت کا حکم دیا۔ اس کے بعد کتبہ میں شاہی اعلان کا ذکر ہے جو ۶۳۸ء کے ساتویں ماہ میں صادر ہوا کہ مسیحی اصول نہایت اہم ہیں اور مسیحیت کی رسوم از حد سادہ اور دلآویز ہیں۔ اس کے اصول بنی آدم کے لئے شمع ہدایت ہیں" اس کے بعد کتبہ میں لکھا ہے کہ "جب تک یہ اصول ملک کے ہر شعبہ پر حاوی رہے ملک کی حالت بہتر ہوتی گئی اور ہر جگہ امن رہا۔ ہر شہر گرجاؤں سے بھرا تھا" آخر میں ان شہنشاہوں کے زمانہ کی خوشحالی کا ذکر ہے جو مشرف بہ مسیحیت ہو گئے تے چینی زبان کی دائیں اور بائیں طرف سریانی حروف میں لکھا ہے۔ "آدم ڈیکن نمائندہ اسقف اور ملک چین کا پوپ جو اب آبائے کلیسیا آقا اور مولا یوحنا یشوع بطریق عالم" کے زمانہ میں تھا۔ عبارت کے نیچے آدم کا اور اس کے باپ کا جو "ترکستان کے شہر بلخ کا پریسٹ" تھا اور اس کے آرچ ڈیکن کا ذکر ہے۔ لوح کے بائیں ہاتھ کے کنارے کی جانب ۶۷ شامی پریسٹوں اور ۶۱ چینی پریسٹوں کے نام

درج ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق سے ناظرین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ نسطوری کلیسیا میں تبلیغی روح کیسی موجزن تھی۔ اس کے مبلغین نے براعظم ایشیا کے تمام ممالک میں اور بالخصوص ہندوستان۔ میدیا۔ آرمینیا۔ بکتریا۔ اور سلسلۂ کوہ قاف کے شمال کی جانب کے تاتاری ملکوں میں انجیل جلیل کا پیغام ایسی کامیابی کے ساتھ پہنچایا کہ مورخ گبن (جو مسیحی نہیں تھا) ہمکو بتلاتا ہے۔ کہ "خلیج ایران سے لے کر بحر کیسپین تک اس قدر بے شمار کلیسیائیں قائم تھیں جو تعداد میں قریباً لامحدود تھیں۔ ان کا ایمان، ان کے راہبوں اور شہیدوں کی تعداد اور پاکیزہ زندگی سے ہر کس و ناکس پر عیاں تھا۔" پھر یہی مورخ لکھتا ہے "مابعد کے زمانہ میں نسطوریوں کا تبلیغی جوش اُن حدود کو بھی پار کر گیا جو یونانی اور ایرانی سلطنتوں کی حرص و طمع کی راہ میں مانع ثابت ہوئی تھیں۔ سمرقند اور بلخ کے مسیحی مبلغین بغیر کسی طرح کے خوف و ہراس کے بادیہ پیما تاتاریوں کے پیچھے پیچھے ہر جگہ پہونچے۔ وہ اماؤس (Imaus.) کی وادیوں اور سیلنگا (Selinga.) کے کناروں پر کے خیموں میں جا داخل ہوئے۔ انھوں نے ان جاہل اور وحشی گڈریوں کو خدا کی تعلیم دی اور خونخوار جنگجو اقوام کو صلح اور انسانیت کے اصول سکھلا دیئے۔"[۲] نسطوری کلیسیا کے بشپوں کے صدر مقام بھی ہر جگہ پائے جاتے تھے مثلاً متعدد بشپوں کے صدر مقام آرمینیا اور شام کے ممالک میں تھے۔ ایران میں ان کے صدر مقام ایلم، نسی بس۔ بیت جرما۔ اور کرخ میں تھے۔ ملک میدیا کی جانب بشپ کا صدر مقام حلوان میں تھا۔ خراسان کا بشپ مارا میں رہتا تھا۔ کمبوڈیا کا

بشپ حارا میں سکونت کرتا تھا۔ بحر کیسپین پر راجا اور ترکستان بشپوں کے صدر مقام تھے۔ دیلین۔ سمرقند اور ماوراءالنہر میں بشپ مقیم تھے۔ تاتاریں نسطوری بشپ توغت کے مقام میں رہائش رکھتے تھے۔ کاشغر ترکستان چین اور ہندوستان میں متعدد بشپوں کے صدر مقام تھے۔ چنانچہ مورخ نیل کہتا ہے "نسطوری مبلغین نے اپنے خیمے' خانہ بدوش تاتاریوں میں جا لگائے۔ مرکزی ایشیا۔ جنوبی اور مشرقی ایشیا کے تمام ممالک ان کے سامنے تھے۔ وہ لنکا۔ ملاکا۔ چین اور جاپان تک پھیل گئے۔ تبت کا لاما ان کی تبلیغی مساعی سے ترساں وہراساں تھا۔ پنجاب کے چاول کے کھیتوں میں وہ کھڑے ہوکر انجیل کی منادی کیا کرتے تھے۔ بحر آرال کے ماہی گیروں میں وہ مسیحی اصول کی تعلیم دیتے تھے۔ منگولیا کے لق و دق بیابانوں میں وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے تھے۔ سنگن فو کا مشہور کتبہ اس بات کا گواہ ہے کہ انھوں نے چین کو مسیح کی خاطر فتح کرلیا تھا۔ ہندوستان کا زمورن ان کی روحانی قوت واقتدار کی وجہ سے ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ گیارہویں صدی کے اوائل میں اس پیٹریارک کا اختیار اس قدر وسیع ہوگیا تھا۔ کہ اس کے ماتحت پچیس میٹروپولیٹن تھے جن کا اختیار چین سے لے کر دجلہ تک اور جھیل بیکال سے لے کر راس کماری تک تھا۔ جو صدر اسقف بغداد کے آس پاس کے

عـه زمورن ملے آلی راجاؤں کا خطاب ہے۔ اصل سنسکرت لفظ سمدری ہے۔ جو ملے آلم زبان میں بگڑ کر سموری ہوگیا اور انگریزی میں بگڑ کر زمورن ہوگیا۔

ممالک میں رہتے تھے وہ ہر سال ایک دفعہ پیٹریارک کی کونسل میں حاضر ہوتے تھے لیکن دور دراز کے ممالک کے صدر استف چھ سالوں میں ایک دفعہ اپنی متابعت کا خط پیٹریارک کو بھیجا کرتے تھے۔ غالباً رومی کلیسیا کے عظیم الشان پوپ اِنّوسنٹ سوم (Innocent III.) کا اختیار بغداد کے پیٹریارک کے اختیار کے برابر وسیع نہیں تھا اگرچہ پوپ مذکور کے ماتحت بیس کروڑ مسیحی تھے۔

نسطوری کلیسیا کا زوال

یوں تو ساسانی خاندان کے وقت ہی سے آفاتِ زمانہ نے ایران کی کلیسیا پر پے در پے حملے کئے تھے لیکن اسلامی زمانہ کی متواتر ایذا رسانیوں نے بالآخر نسطوری کلیسیا کو تباہ و بدحال کر دیا۔ چونکہ کلیسیا کا مرکز پیٹریارک تھا لہذا مسیحیت کے دشمنوں نے صدیوں تک پیٹریارک اور پیٹریارکیٹ کو تمام ایذا رسانیوں کا مرکز بنائے رکھا۔ اس طویل عرصہ میں یہ پیٹریارک ایک جگہ سے دوسری جگہ پناہ لیتے رہے اور اپنا صدر مقام حالاتِ زمانہ کے مطابق بدلتے رہے۔ انھوں نے ۷۶۲ء میں بغداد کو اپنا صدر مقام بنایا۔ ۱۲۵۸ء میں وہ اربیل یعنی موصل چلے گئے۔ ۱۳۲۰ء میں پیٹریارک کو موصل چھوڑنا پڑا اور اس نے الکوش کو اپنا صدر مقام بنایا۔ جہاں سے ۱۵۵۱ء میں اس کو ترک جانا پڑا۔ ۱۵۹۰ء میں اس کو خوسرا (سلامس) میں صدر مقام تبدیل کرنا پڑا۔ دو سال بعد قدشنیس (Qudshanes.) صدر مقام بنا جہاں وہ ساڑھے تین سو سال تک مقیم رہے۔ اگرچہ نسطوری کلیسیا ان ایذا رسانیوں کے باوجود تبلیغی مساعی میں برابر مصروف

رہی تاہم وہ اُن صدیوں کے دوران میں آہستہ آہستہ کمزور ہوتی گئی۔ بے شمار لوگوں نے تنگ آکر اسلام قبول کر لیا۔ اور جو غیور مسیحی تھے وہ دیگر ممالک کی جانب ہجرت کر گئے۔ مسیحیوں کے شہروں کے شہر مسلمانوں نے تباہ کر دیئے جن کے کھنڈرات آج تک موجود ہیں۔ سر جان میلکم لکھتا ہے۔ کہ "اگر صرف ان کھنڈرات کی فہرست بنائی جائے تو اس کے لئے کئی صفحے درکار ہوں گے۔ خلفا کے زمانہ میں ایرانی سلطنت میں کرمان۔ بلخ۔ بخارا۔ سیستان۔ خراسان اور افغانستان شامل تھے۔ جہاں مسیحی زبردست تعداد میں سکونت رکھتے تھے۔ ان ممالک میں کلدی کلیسیا کے بشپوں کے صدر مقام تھے۔ ان آٹھ سو سال میں اسلامی حکمرانوں نے ہر ملک اور ہر جگہ کی کلیسیا کو اپنے مظالم کا شکار بنائے رکھا۔" سکے لاکھوں مسیحی مارے گئے۔ ہزاروں نے اسلام قبول کر لیا۔ خانقاہیں۔ گرجے۔ کتب خانے۔ دار العلوم اور دیگر مسیحی ادارے بالخصوص دینیات کے مدرسے یکسر تباہ و برباد ہو گئے یا آگ کی نذر کر دیئے گئے۔ مسیحیوں کے شہروں کے شہر مسلمانوں کے ہاتھوں اور تاتاری وحشیوں کے ہاتھوں جلا دیئے گئے۔ جب چنگیز خاں کے بھتیجے ہلاکو خاں نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو فتح کر لیا تو نسطوری کلیسیا کو سخت دھکا پہونچا' اگرچہ ہلاکو خاں کی ماں اور بیوی دونوں مسیحی تھیں۔ ڈیڑھ سو سال بعد چودھویں صدی کے آخر میں کلیسیا پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سنہ[illegible]ء میں تیمور نے اپنی فوجوں کو بھیج کر نسطوری یا کلدی کلیسیاؤں کی بیخ کنی کر دی۔ ان ظالم سفاکوں نے مسیحی مردوں۔ عورتوں اور بچوں کو چن چن کر شہید کر دیا۔ جو مسیحی بچ رہے وہ بھاگ کر کردستان کی دشوار گذار پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔

انہی ایام میں جب نسطوری کلیسا موت کی تاریک وادی میں سے گذر رہی تھی رومی کلیسا کے پوپ نے سنہ ۱۳۰۰ء سے اس کو امداد پہونچانے کی بجائے اپنے تابع فرمان کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ لیکن اس کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی۔ سولھویں صدی میں جب یہ کلیسا دشمنوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہی تھی اس میں باہمی تنازعہ شروع ہو گیا۔ سنہ ۱۵۵۲ء میں پیٹریارکیٹ کے دو دعویدار پیدا ہو گئے۔ اصل بات یہ تھی کہ سنہ ۱۲۶۵ء سے ایک ہی خاندان سے پشت در پشت پیٹریارک بنتے چلے آئے ہیں اور ہر پیٹریارک کی موت پر اس کا بھتیجا پیٹریارکیٹ کی گدی پر بیٹھ جاتا ہے اور ہر پیٹریارک اپنا نام مار شمعون رکھ لیتا ہے۔ گدی کے دونوں دعویدار متوفی پیٹریارک شمعون کے بھتیجے تھے۔ لیکن ایک دعویدار صلحا کی پشت پر کافی میٹروپولیٹن نہیں تھے۔ پس اس نے روم کے پوپ کی مدد مانگی جس نے اس کی تقدیس کردی اور وہ بھی بابل کا پیٹریارک بن بیٹھا۔ اس نے اپنا نام مار ایلیاہ اور موصل کو اپنا صدر مقام بنا لیا۔ اب بابل کے دو پیٹریارک ہو گئے۔ ایک مار شمعون جس کا صدر مقام کردستان میں قدشنیس تھا اور دوسرا مار ایلیاہ جس کا صدر مقام موصل تھا۔ نسطوری یعنی کلدی کلیسا کا بیشتر حصہ مار شمعون کے ماتحت ہی رہا۔ مار ایلیاہ برائے نام رومی پوپ کے ماتحت تھا کیونکہ وہ اور اس کے جانشین نسطوری عقائد کے ہی پیرو رہے۔ لیکن جب سنہ ۱۷۷۸ء میں رومی کلیسا کے نامزد پیٹریارک کا جانشین مر گیا تو پوپ نے اپنا آدمی عمانوئیل گدی پر بٹھلا دیا جس نے اپنی گردن مکمل طور پر رومی کلیسا کے جوئے تلے کردی۔ اس باہمی نفاق کی وجہ سے کلیسا دق بدن کمزور اور نڈھال ہوتی گئی۔ سنہ ۱۸۴۳ء میں

کُردوں نے اٹھارہ ہزار نسطوری مسیحیوں کو شہید کر دیا۔ ان کے گرجاؤں کو مسمار کر دیا گیا۔ مسیحی قصبے اور دیہات نذرِ آتش کر دیئے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسیا کی رہی سہی طاقت بھی جاتی رہی۔

جنوبی ہندوستان کی کلدی کلیسیا پر بھی قدرتی طور پر اس نفاق کا اثر پڑا۔ موصل کے پیٹریارک مار ایلیاہ سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں اپنے بشپ جنوبی ہندوستان کو بھیجتے رہے۔ چنانچہ مار جبرئیل ۱۷۰۸ء سے ۱۷۳۱ء تک مالابار کی بعض کلدی کلیساؤں پر حکمران رہا۔ کیونکہ مالابار کے سیدھے سادے مسیحی دونوں پارٹیوں میں تمیز نہ کر سکے۔ اس کی موت کے بعد ۱۸۶۰ء تک یعنی پیٹریارک عمانوئیل ایلیاہ کے گدی نشین ہونے تک کوئی بشپ موصل کی طرف سے بھیجا نہ گیا۔ اور جنوبی ہند کے تمام کلدی مسیحی مار شمعون کے ماتحت ہی جمع رہے۔ لیکن جب موصل کا پیٹریارک مکمل طور پر رومی کلیسیا کے ماتحت ہو گیا تو اس کے فرستادہ بشپوں نے کلدی کلیسیا میں خلل اندازی شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں بشپ مار روکوس (Mar Roccos.) اور مار میلس (-Mar Mellus.) کی کارروائیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جب کلدی کلیساؤں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو انھوں نے پادری اینٹونی تھونڈاناتھ (Anthony Thondanath.) کی زیرِ سرکردگی ایک وفد اپنے پیٹریارک مار شمعون کے پاس روانہ کیا جس نے پادری تھونڈاناتھ کی تقدیس کر کے اس کو میٹرو پولی ٹن بنا کر اور مار اودھ یسوع نام دے کر واپس جنوبی ہند بھیجدیا۔ یہ ہندوستانی بشپ رومی کلیسیا کے ساتھ دلیرانہ جنگ کرتا رہا۔

HIS GRACE MAR TIMOTHEUS

Chaldean Syrian Metropolitan Of India.

لیکن جب وہ ۱۹۰۰ء میں مرگیا تو یہ کلیسیا آٹھ سال تک بغیر کسی بشپ کے رہی۔ بالآخر ۱۹۰۸ء میں مار آبگی ملک تھو تھیوس ہندوستان کا میٹروپولی ٹن اور مار شمعون کا ڈیلیگیٹ ہو کر جنوبی ہند آیا اور پندرہ سال تک رومی کلیسیا سے مقدمہ بازی کرتا رہا۔ جب وہ اپنا مقدمہ جیت گیا تو اس نے اپنی توجہ کلیسیائی اصلاحات کی طرف مبذول کی۔ کیونکہ رومی کلیسیا کی دخل اندازی کی وجہ سے جنوبی ہند کی کلدی کلیسیا کے عقائد و رسوم میں خرابیاں واقع ہوگئی تھیں۔ اس بشپ کا صدر مقام ترچور تھا جہاں اس نے خادمانِ دین کے لئے مدرسۂ دینیات جاری کیا۔ ڈیکنوں اور پریسٹوں کا تقرر کیا۔ پرائمری اور ہائی سکول کھولے۔ ایک چھاپہ خانہ قائم کیا جس میں سریانی۔ انگریزی اور ملیالی زبانوں میں کتابیں چھپتی تھیں۔ مختلف مقامات میں چھ گرجے بنوائے۔ لڑکوں کے لئے سنڈے سکول اور عورتوں کے لئے جماعتیں منظم کیں۔ اس نے اپنی ۲۷ سالہ خدمت میں ہر طرح سے کوشش کی کہ اس کی نیم جان کلدی کلیسیا میں جان پڑ جائے۔ لیکن اس بشپ سے ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے کسی اور بشپ کی تقدیس نہ کی جو اس کی موت کے بعد اس کی جگہ لے لیتا۔ حالانکہ پیٹریارک کے ڈیلیگیٹ ہونے کی حیثیت سے اس کو یہ اختیار حاصل تھا۔ جب وہ ۳۰ راپریل ۱۹۴۵ء کے روز مر گیا تو کلدی کلیسیا بغیر کسی بشپ کے رہ گئی اور تا حال (۱۹۵۰ء) کوئی دوسرا بشپ ان کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اس کلیسیا میں کل دس بارہ ہزار نفوس شامل ہیں۔ اور وہ پھر نہایت نڈھال ہوگئی ہے۔ خدا کی شان! ایک دن وہ تھا جب لاکھوں ہندوستانی اور کروڑوں

ع ۵ بشپ تھو تھیوس کی تصویر مقابل کے صفحہ پر ہے۔

ایشیائی مسیحی اس کلیسیائے مشرق کے نام لیوا تھے اور اب کلدی کلیسیا کی ابتری اور موجودہ پیٹریارک کی جلاوطنی کے باعث ان کے پاس کوئی بشپ بھی موجود نہیں۔ ہندوستان کی تمام کلیسیاؤں میں کلدی کلیسیا سے (جو اپنے آپ کو نسطوری نہیں کہتی بلکہ "کلیسیائے مشرق" کہتی ہے) زیادہ افسوس ناک اور حسرت ناک کہانی غالباً کسی دوسری کلیسیا کی نہیں ہے۔

کلدی کلیسیا کا انجام

ہندوستان کے باہر کی کلدی کلیسیا اور بابل کے پیٹریارک کی کہانی بھی کم حسرت ناک نہیں ہے۔ جب پہلی عالمگیر جنگ (از ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) چھڑی تو برطانیہ کے ایما پر ان کلدی مسیحیوں نے ترکی کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اُن کے ساتھ برطانیہ نے وعدہ کیا کہ ان کی قوم۔ قومی روایات اور ثقافت اور ان کے مذہب کی کماحقہ حفاظت ہوگی۔ برطانوی گورنمنٹ اُن کو ان کے پہاڑی مقاموں اور گڑھوں سے نکال کر موصل کے شمال سے عراق لے آئی تاکہ اتحادی اقوام کی جنگی چالوں کے مطابق ان کو استعمال کر سکے۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۵ء تک جنگ میں اور اس کے بعد قریباً تین لاکھ کلدی مسیحی مارے گئے۔ جب اتحادیوں کو فتح نصیب ہوئی تو برطانیہ حسب عادت اپنے وعدوں کو بھول گیا۔ کلدی مسیحیوں کو کوئی قطعۂ زمین نہ دیا گیا جس میں وہ اپنی حکومت قائم کر کے اپنے مذہب و قوم کی حفاظت کر سکیں۔ اس کے برعکس عراق کے عرب خاندان کو برطانیہ کے زیر سایہ تخت نشین کر دیا گیا۔ حکومتِ عراق نے ان تمام

وعدوں کی خلاف ورزی کی جو اس نے ان مسیحیوں کے متعلق برطانیہ اور جمعیتہ الاقوام کے ساتھ کئے گئے تھے۔ اگست ۱۹۳۳ء میں ان پر جہاد کا اعلان کر دیا گیا اور ہر کلدی مسیحی کے سر کیلئے ایک پونڈ انعام نکالا گیا۔ ۷ راگست ۱۹۳۳ء کے روز ان کا قتل عام کیا گیا۔ اور دو ہفتہ کے اندر ان کے ہزاروں مسیحی قتل کئے گئے۔ مصلوب کئے گئے یا زندہ جلا دیئے گئے۔ ان کے گھروں اور قصبوں کو لوٹ کر ان کو آگ کی بھینٹ چڑھایا گیا۔ تقریباً بیس لاکھ کی جائداد اور زرِ نقد لوٹ لیا گیا۔ مقدس کتابوں کو پھاڑ کر جلا دیا گیا۔ ۱۰ راگست کے روز ان کے ستائیس ۲۷ سالہ نوجوان پیٹریارک مار ایشاعی شمعون کو ملک بدر کر دیا گیا۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۳ء کے روز پیٹریارک نے تمام دنیا کی مسیحی کلیساؤں سے اپیل کی۔ لیکن سوائے زبانی ہمدردی کے اور کچھ فائدہ نہ ہوا۔ برطانیہ کے ہوائی جہاز اوپر سے قتلِ عام کے نظارے کا تماشا دیکھتے رہے۔ لیکن اس سفاکی کی تصویریں لینے کے علاوہ انھوں نے کچھ نہ کیا۔ اگر کلدی مسیحیوں کی بجائے انگریزوں کو قتل کیا جاتا تو معلوم نہیں کہ اس کا انجام کیا ہوتا۔ اس کے بعد ایران میں بھی کلدی کلیسیا کے مسیحیوں کا قتل عام کیا گیا۔ اور اب اس کلیسیا کے چند ہزار شرکا دنیا کے مختلف کونوں میں پراگندہ ہیں۔

۱۹۴۰ء سے ان کا موجودہ پیٹریارک امریکہ کے شہر شکاگو میں پناہ گزیں ہے۔ وہ اپنے خاندان میں بست دلیم کیتھولی کوس پیٹریارک ہے۔ اور کلیسیائی سلسلۂ پیٹریارکیٹ میں وہ ایک سو آئیسواں پیٹریارک ہے

نسطوری کلیسیا کے عقائد و رسوم

چونکہ کلدی کلیسیا کا تعلق پنجاب اور شمالی ہند کی

کلیساؤں کے ساتھ کم وبیش بارہ سو سال تک رہا اور جنوبی ہندوستان کی کلیساؤں کے ساتھ سولہ سو سال سے چلا آیا ہے لہذا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ذیل میں اس کلیسا کے بعض مخصوص عقائد و رسوم کا مختصر طور پر ذکر کریں گے۔

(۱) نسطوری کلیسا کا عقیدہ تجسم مسیح کے بارے میں یہ ہے کہ آنخداوند کی شخصیت (Person.) ایک تھی جس میں دو ذاتیں (Natures.) اور دو جوہر (Substances.) تھے۔ مسیح "خدا کی ہیکل کلمہ" تھا جس نے جسم اختیار کیا تھا لیکن کلمہ مجسم نہیں تھا۔

(۲) روح القدس کے صادر ہونے کے متعلق نسطوری کلیسا پرانا یاوہ کے عقیدہ کی قائل ہے کہ وہ صرف "باپ سے صادر ہے" یہی عقیدہ تمام مشرقی کلیساؤں کا ہے لیکن مغربی کلیسا کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ "باپ اور بیٹے سے صادر ہے"۔

(۳) یہ کلیسا حضرت مریم کے خطاب "مادرِ خدا" کی سخت مخالف ہے اور کہتی ہے کہ آپ "اُم مسیحا" یعنی "مسیح کی ماں" ہیں لیکن "اُم اللہ" یعنی "خدا کی ماں" نہیں ہیں۔

(۴) یہ کلیسا مقدسہ مریم بتولہ کی پرستش نہیں کرتی۔

(۵) کلدی کلیسا مورتی پوجا کے خلاف ہے۔ اس کلیسا کے پیٹریارک کے اپنے ملک کی کلیساؤں میں مورتیاں نظر نہیں آتیں۔ اور نہ مسیح مصلوب کی مورت (Crucifix.) مذبح پر رکھی جاتی ہے لیکن راقم الحروف نے جب جنوری ۱۹۴۷ء میں ترچور (واقع جنوبی ہند) میں اس کلیسا کا کیتھیڈرل دیکھا تو وہاں مذبح کے پیچھے دیوار میں

لکڑی کا خوبصورت پردہ تھا۔ جس میں مورتیاں کھدی ہوئی تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہندوستان میں اس کلیسیا کے بعض گرجاؤں میں رومی کلیسیا کے رسوخ اور اقتدار اور دست اندازی کے باعث (جس کا مفصل ذکر اس سلسلہ کی جلد سوم میں کیا جائے گا) مورتیاں پائی جاتی ہیں لیکن ان کی پرستش نہیں کی جاتی۔ تہواروں اور عیدوں کے موقع پر مورتیوں کو مذبح پر رکھا جاتا ہے اور جلوس کے وقت بھی مورتیاں نکالی جاتی ہیں، گو پریسیٹ صرف سادہ صلیب کو ہی ہاتھوں میں لے کر جلوس میں نکلتے ہیں۔ ان مورتیوں کے سامنے نہ تو سجدہ کیا جاتا ہے اور نہ ان کے حضور دعا کی جاتی ہے۔ اور نہ ان کو بوسے دیئے جاتے ہیں۔ ان کو محض سجاوٹ اور زیبائش کی خاطر اور تہواروں کی رونق بڑھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم نے کلدی کلیسیا کے دوسرے گرجاؤں میں (جو مرحوم میٹرپولیٹن نے بنوائے تھے) کوئی مورتی نہیں دیکھی۔ بلکہ ان میں ہم نے صرف سادہ صلیب ہی دیکھی جو قربانگاہ پر رکھی تھی۔ یہ گرجے نہایت سادہ اور ہر قسم کے تکلف اور زیبائش و آرائش سے معرا تھے۔

(۶) کلدی کلیسیا اعراف (Purgatory.) کی قائل نہیں ہے جو خالص رومی کلیسیا کے عقیدہ کا جزو ہے۔ رومی کلیسیا کا یہ عقیدہ ہے کہ انسانی ارواح اپنے گناہوں کے عذاب اور دکھ سے پاک ہونے کی خاطر اعراف میں رکھی جاتی ہیں اور دعا اور "ماس" (-Mass.) کا مقصد یہ ہے کہ اعراف میں ان کو دکھ اور عذاب سے رہائی ملے۔ لیکن کلدی کلیسیا "عالم ارواح" یعنی شیول

(Sheol.) کی قائل ہے جہاں انسانی روحیں عذاب میں نہیں بلکہ آرام میں نیم شعوری اور نیم خفتگی کی حالت میں رہتی ہیں۔ نیک روحیں خدا سے ملنے کی خوشی میں اور بری روحیں عذاب پانے کے بیم و خوف کی حالت میں رہتی ہیں۔ نیک روحیں کاملیت کی جانب جاتی ہیں۔ اور اس دنیا کے ایمانداروں کی دعائیں ان کو زیادہ کامل ہونے میں مدد دیتی ہیں۔ پس کلدی مسیحی اس مقصد کو مدنظر رکھ کر مُردوں کے لئے دعا کرتے ہیں اور "ماس" ادا کرتے ہیں۔

(۷) کلدی کلیسا میں خادمانِ دین کے نو درجے ہیں۔ پیٹریارک میٹروپولیٹن۔ بشپ۔ کور ایپسکوپا (Cor Episcopa.) آرچ ڈیکن۔ پریسٹ۔ ڈیکن۔ ہائی پوڈیکن (Hypo-deacon.) اور قاری (Reader.)۔

(۸) کلدی کلیسا کے مسیحی سریانی اور یونانی کلیساؤں کے مُردہ علما اور فضلاء کے لئے دعائیں مانگتے ہیں اور یہ امر فقط کلدی کلیسا ہی سے مخصوص ہے۔

(۹) کلدی کلیسا میں وہ سب خادمانِ دین شادی کر سکتے ہیں جو بشپوں سے پچھلے درجے کے ہیں۔ لیکن رومی کلیسا میں بشپ اور پریسٹ شادی نہیں کر سکتے۔

(۱۰) کلدی کلیسا میں عام مسیحی گرجا کے مقدس مقام (Sanctuary.) کے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ صرف بشپ۔ پریسٹ وغیرہ ہی اس مقام میں جا سکتے ہیں۔

(۱۱) کلدی کلیسا بدھ اور سنیچر کے دن روزہ رکھتی ہے لیکن

رومی کلیسیا ہر جمعہ اور سنیچر کے دن روزہ رکھنے کا حکم دیتی ہے۔

(۱۲) کلدی کلیسیا میں ہولی واٹر (Holy water.) پاک پانی استعمال کیا جاتا ہے اور گرجا کے دروازہ کے باہر رکھا جاتا ہے۔

(۱۳) رومی کلیسیا سات سکرامنٹ مانتی ہے۔ لیکن کلدی کلیسیا نے سکرامنٹوں کی تعداد مقرر نہیں کی۔ اگرچہ عام طور پر اُن کے علماء سات سکرامنٹ ہی مانتے ہیں۔ لیکن وہ رومی کلیسیا کے سکرامنٹوں سے مختلف ہیں۔ کلدی کلیسیا میں دیگر مشرقی کلیساؤں کی طرح بپتسمہ کے بعد ہی استحکام کی رسم عمل میں آتی ہے۔

(۱۴) رومی کلیسیا کا یہ عقیدہ ہے کہ عشاءِ ربانی کی رسم میں تقدیس کے الفاظ کے بعد روٹی اور مَے کی جوہر ذات بدل جاتی ہے۔ اور وہ فی الحقیقت مسیح کا بدن اور خون بن جاتے ہیں۔ لیکن کلدی کلیسیا اس عقیدہ کی قائل نہیں۔ وہ یہ مانتی ہے کہ تقدیس کے الفاظ کے بعد روٹی اور مے میں روحانی طور پر تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا کہ جو ایماندار سچے ایمان سے ان کو کھاتے پیتے ہیں وہ ان ظاہری نشانوں کے ساتھ مسیح کو بھی پاتے ہیں۔

(۱۵) عشائے ربانی کی رسم میں شامل ہونے سے پہلے گناہوں کے اقرار کی نسبت کلدی کلیسیا کا یہ دستور ہے کہ مسیحی فرداً فرداً اپنے گناہوں کا اقرار کر سکتے ہیں۔ یا اگر وہ چاہیں تو مجموعی طور پر جماعت کے ساتھ گناہوں کا اقرار کر سکتے ہیں۔

(۱۶) عشائے ربانی میں ایمانداروں کو روٹی اور مے دونوں دی جاتی ہیں۔ بارھویں صدی سے رومی کلیسیا نے مسیحی عوام کو

سے دینا بند کردیا ہے۔ مشرقی کلیساؤں میں بدیں خوف کہ مبادا
تقدیس شدہ مے گر نہ جائے روٹی کو مے میں بھگو کر دیا جاتا ہے۔
کلدی کلیسا میں بھی یہی رسم ہے گو روٹی اور مے الگ الگ بھی دی جاتی
ہے۔ لیکن عوام کو یہ اجازت نہیں کہ وہ پیالہ کو ہاتھ لگائیں اگرچہ وہ
پیتے وقت منہ لگا سکتے ہیں۔ عشائے ربانی کی جس رسم میں راقم الحروف
شامل ہوا تھا اُس میں روٹی اور مے الگ الگ دی گئیں اور پریسٹ
پیالہ میں سے ایک چھوٹے چمچہ سے نکال کر پرستاروں کے کھلے
منہ میں ڈالتا تھا۔

(۱۷) تمام مشرقی کلیساؤں میں یہ دستور ہے کہ عشائے ربانی کی
رسم کسی ایک گرجا کے مذبح پر دن میں صرف ایک بار عمل میں آسکتی ہے۔
کلدی کلیسا میں بھی ایک ہی مذبح پر دن میں ایک سے زیادہ مرتبہ یہ رسم
عمل میں نہیں آسکتی۔

(۱۸) تمام مشرقی کلیسائیں عشائے ربانی کے وقت صرف خمیری
روٹی استعمال کرتی ہیں۔ کلدی کلیسا بھی خمیری روٹی استعمال کرتی ہے۔
لیکن مغربی کلیسا میں بے خمیری روٹی کے استعمال کا دستور ہے۔

(۱۹) کلدی کلیسا عشائے ربانی کی رسم کو عمل میں لانے کے وقت
مذبح پر سادہ صلیب (Cross.) رکھتی ہے۔ تمام مشرقی
کلیساؤں میں یہی دستور ہے۔ لیکن رومی کلیسا مسیح مصلوب کی مورت
(Crucifix.) مذبح پر رکھتی ہے۔

(۲۰) کلدی کلیسا میں عشائے ربانی کی نماز کے بعد سکرامنٹ
کو بچا کر رکھنے (Reservation of the Sacrament.) کا

دستور بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ کرنا لازمی امر نہیں ہے۔ صرف ضرورت کے وقت ہی سکرامنٹ کو بجایا جاتا ہے۔

(۲۱) کلدی کلیسا مبارک جمعہ کے دن کے بعد کے سنیچر کی شام کو عشائے ربانی کی رسم عمل میں لاتی ہے۔ یہ دستور صرف اس کلیسا سے مخصوص ہے۔

(۲۲) رومی کلیسا میں "ماس کی دعائے خیر" -Benediction of the Mass. کا دستور ہے لیکن کلدی کلیسا میں ایسا دستور نہیں پایا جاتا۔

(۲۳) رومی کلیسا کی عبادت لاطینی زبان میں ہوتی ہے۔ لیکن کلدی کلیسا سُریانی زبان میں عبادت کرتی ہے اور اس کی عبادت کی کتابیں سریانی زبان میں ہی ہوتی ہیں۔

بابِ چہارم

پنجاب شمالی ہندوستان اور وسط ہند کی کلیسیائیں

فصلِ اوّل

نسطوری کلیسیائیں

مقدس توما کی آمد اور کلیسیا کا آغاز

حصۂ اول میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ منجی عالمین کے بارہ رسولوں میں سے ایک یعنی مقدس توما رسول خود بنفس نفیس بادشاہ گنڈوفرس کے زمانہ میں ۵۰ء کے قریب شہر ٹیکسلا میں جو راولپنڈی کے نزدیک ہے تشریف فرما ہوئے۔ آپ نے زرتشتیوں۔ بدھ مذہب والوں۔ برہمنوں اور یونانیوں میں کام کر کے مختلف مقامات میں کلیسیائیں قائم کیں اور جنوبی ہند کی جانب روانہ ہونے سے پہلے آپ نے ان کلیسیاؤں کے لئے بشپوں کی تقدیس کی۔ ظالم کشان بادشاہوں نے پنجاب کے مسیحیوں کا قتل عام کیا۔

اور ہر ممکن کوشش کی کہ مسیحی کلیسیا کی بیخ کنی کر دیں۔ وہ اپنے مقصد میں
جیسا ہم حصۂ اول میں ذکر کر چکے ہیں قریباً کامیاب بھی ہو گئے۔ لیکن
چونکہ شمالی ہندوستان کے ارد گرد کے ممالک میں ہر جگہ ایرانی کلیسیا
کے مبلغین کی طفیل کلیسیائیں قائم تھیں لہٰذا مسیحیت کا جو پودا رسولِ شہید
نے لگایا تھا وہ برباد نہ ہوا۔ علاوہ ازیں چونکہ اُن دنوں میں ایران اور
ہندوستان کی شاہراہ پر بھی کلیسیائیں موجود تھیں اور وہ دن دگنی اور
رات چوگنی ترقی کر رہی تھیں لہٰذا دوسری اور تیسری صدی میں پنجاب
اور شمال مغربی ہندوستان کی کلیسیائیں از سرِ نو قائم اور استوار ہو گئیں
چنانچہ ڈاکٹر منگانا چھتیس ۳۶ بشپوں کے صدر مقاموں کے نام بتلاتا ہے
جو ہندوستان کی راہ میں یا ہندوستان کے قرب و جوار میں واقع تھے[1]
مثلاً اردشیر فری (یا موجودہ فیروز آباد جو صوبۂ فارس میں واقع ہے۔)
اردشیر فرید (جو بلوچستان میں واقع ہے) بیت کترا گ ہرمزدارد شیرہ
کرک۔ لیدان (جو خوزستان میں واقع ہے) رورد شیر (جو صوبۂ فارس
کا دار السلطنت تھا) ۔ سوزا وغیرہ۔ ۲۲۵ء میں فرات میشان (موجودہ
بصرہ) بشپ کا صدر مقام تھا۔ خلیج کی دوسری جانب عرب میں بھی
بشپ کا صدر مقام ہوتا تھا[2]۔ بیت لاپت (جس کا بعد میں جندیشاپور
نام پڑا) ۲۲۵ء کے بعد سے بشپ کا صدر مقام رہا۔ بلوچستان
اور افغانستان کے قرب و جوار میں بھی مسیحی کلیسیائیں تھیں اور ان میں
بشپوں کے صدر مقام تھے۔ دریں حالات ایرانی کلیسیا کے جوشیلے
مبلغین شمال مغربی ہندوستان اور پنجاب میں شمال اور شمال مغرب کے
درّوں کی راہ سے آتے رہے۔ اور انھوں نے پہلی تین صدیوں میں

بے شمار مسیحی کلیسیائیں قائم کر دیں۔ ان کلیسیاؤں کے اکثر شرکاء وہ ہندوستانی تھے جو بت پرستی اور شرک سے توبہ کرکے خداوند کی نجات کی روشنی میں آگئے تھے سہ ایران اور مسوپتامیہ کے مبلغین ایرانی مسیحی تاجروں اور دیگر اہل حرفہ کے ہمراہ آتے تھے کیونکہ تیسری صدی مسیحی کے اوائل تک ہندوستان کا شمال مغربی حصہ اور پنجاب کا ملک' ایرانی سلطنت کا ایک وسیع صوبہ تھا جس پر ایرانی حکام مامور تھے جو مسیحیت کے خلاف نہیں تھے لہذا قدرتاً یہاں بھی مسیحیت چمک اٹھی۔ جب چوتھی صدی میں ساسانی خاندان کے بادشاہ شاپور اعظم اور اس کے جانشین یزدجرد اور بہرام گور نے پانچویں صدی میں ایران کی کلیسیا کو ایذائیں دیں تو ان پے درپے کی ایذارسانیوں کی وجہ سے ہزاروں مصیبت زدہ مہاجرین نے شمالی ہندوستان کے ان حصوں میں جاکر پناہ لی جو ایرانی بادشاہوں کے زیر نگیں نہیں تھے۔ جس طرح توما تاجر نے جنوبی ہند میں مسیحیوں کے ایک بڑے گروہ کے ساتھ پناہ لی تھی۔ ان مہاجرین نے ہر جگہ کلیسیائیں قائم کر دیں اور شمالی ہندوستان میں جابجا مسیحی کلیسیائیں وجود میں آگئیں جن کے شرکا بیشتر خالص ہندی نژاد کے تھے۔ چوتھی صدی میں یہ کلیسیائیں صوبہ فارس کے ایرانی میٹروپالی ٹن کے ماتحت تھیں جس کا ریورد شیر زمانہ قدیم سے صدر مقام تھا۔ یہاں کے بشپ ابتدا ہی سے ہندوستان کی کلیسیاؤں کے نگران رہے تھے۔ چنانچہ

سہ ریورد شیر بعد میں رے شہر کے نام سے مشہور ہوا موجودہ بوشہر کے شمال مغرب کی جانب واقع تھا۔ (برکت اللہ)

جیسا ہم باب دوم کی فصل دوم میں بیان کر چکے ہیں، بشپ یوحنا "اسقف ایران و ہندوستانِ اعظم" جو نکایاہ کی کونسل میں حاضر تھا غالباً اسی جگہ کا یعنی روورد شیر کا بشپ تھا۔ چوتھی اور پانچویں صدیوں کے دوران میں یہ کلیسیائیں پنجاب اور شمال مغربی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئیں. اور اس قدر ترقی کر گئیں کہ نسطوری فقیہ ابن الطیب ہم کو بتلاتا ہے کہ پیٹریارک اسحاق (از ۳۹۹ء تا ۴۱۰ء) نے یہاں کے بشپ کو آرچ بشپ مقرر کر دیا۔ ایک اور فقیہ عبدیشوع کہتا ہے کہ پیٹریارک یحب اللہ (--Yahab Alaha.) (از ۴۱۵ء تا ۴۲۰ء) نے یہاں کے بشپ کو آرچ بشپ بنایا تھا۔[۱]

ہندوستان کے میٹروپولیٹن

جب پانچویں صدی میں ایرانی کلیسیا نے نسطوری عقائد کو اختیار کر لیا اور اس کا کیتھولیکوس انطاکیہ کے پیٹریارک سے آزاد ہو کر "کلیسیائے مشرق" کا خود مختار پیٹریارک بن گیا تو پنجاب اور شمالی ہند کی کلیسیائیں جو زمانہ قدیم سے صوبۂ فارس کے میٹروپولیٹن کے ماتحت تھیں نسطوری ہو گئیں گذشتہ باب میں ہم نسطوری کلیسیا کے تبلیغی جوش کا ذکر کر آئے ہیں۔ ان نسطوری مبلغین کی مساعی جمیلہ کی طفیل پنجاب اور شمالی ہند کی کلیسیائیں تقویت پا کر دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی گئیں۔ وہ شمار میں اس قدر بڑھ گئیں کہ خاص ہندوستان کے لئے ایک الگ میٹروپولیٹن مقرر کیا گیا جس کے ماتحت تقریباً ایک درجن بشپ تھے۔ ابن الطیب ہم کو بتلاتا ہے کہ پیٹریارک یشوع یحب دوم

نے اس اہم کام کو سرانجام دیا تھا۔ ہندوستان کی کلیسیائیں شمار میں اس
قدر زیادہ تھیں اور اس قدر طاقتور تھیں کہ ہندوستان کے میٹروپولی ٹن
کا رتبہ چین کے میٹروپولی ٹن سے بڑا تھا جس کا رتبہ سمرقند کے میٹروپولی ٹن
سے بڑا تھا۔

جب تک ہندوستان کا اپنا میٹروپولی ٹن نہیں تھا ہندوستان کی
کلیسیائیں اور بشپ، فارس کے میٹروپولی ٹن کے زیرِاختیار رہتے۔ لیکن
جب ہندوستان کا الگ میٹروپولی ٹن مقرر ہو گیا تو ہندوستان کی کلیسیا
فارس کے میٹروپولی ٹن کے قبضہ سے نکل گئی اور ہندوستان کے بشپ
اس کے اختیار سے باہر ہو گئے۔ اب سے ہندوستان کے میٹروپولی
ٹن خود ہندوستان کی کلیساؤں کے نگران ہو گئے اور ہندوستان کا
میٹروپولی ٹن بلاواسطہ سیدھا پیٹریارکِ بابل کے ماتحت ہو گیا۔ جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ صرف پیٹریارک ہی اس سے اس کے کام کی نسبت
بازپرس کر سکتا تھا۔ فارس کے میٹروپولی ٹن کو یہ بات نہایت ناگوار
معلوم ہوئی کیونکہ قدیم زمانہ سے اس وقت تک ہندوستانی کلیسیائیں
اس کے ماتحت تھیں اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے قبضۂ
اقتدار سے نکل کر براہ راست پیٹریارک کے ماتحت ہو جائیں۔ پس
فارس کے میٹروپولی ٹن پیٹریارک کے اس انتظامی فیصلہ سے نہایت
ناخوش تھے اور سالہا سال تک یہ خدشہ رہا کہ مبادا اس نازک سوال
پر نسطوری کلیسیا میں ایسی پھوٹ پڑ جائے کہ فارس کا میٹروپولی ٹن پیٹریارک
کے تحت سے نکل کر خود مختار نہ ہو جائے۔ کیونکہ فارس کے میٹروپولی ٹن

اب یہ دعویٰ کرنے لگ گئے تھے کہ "ہم مقدس توما رسول کے جانشین ہیں۔ اور ہمارا ماری[عہ] کے صدر اسقف (یعنی پیٹریارک) کے ساتھ کوئی حصہ بخرہ نہیں ہے"۔ اگر نسطوری پیٹریارک زبردست اور دانش مند نہ ہوتے اور عقل کے ناخنوں سے اس گتھی کو نہ سلجھا لیتے تو پھوٹ کے پڑ جانے میں کوئی شبہ نہ رہا تھا۔ پیٹریارک یسوع یحب سوم (از ۶۵۰ء تا ۶۶۰ء) نے ریورد شر کے میٹروپولیٹن کو (جو ایران کا اسقف اعظم (Primate.) بھی تھا) جس کا نام مار شمعون تھا لکھا ہے:-

"خدا سے محبت رکھنے والے مکرم برادر! جس طرح تم نے بشپوں کی تقدیس کے دروازے کو ہندوستان کے باشندوں پر بند کر دیا ہے اور خدا کی بخشش کو ناپائدار دنیا کے فائدوں کی خاطر (جو جسم کی خواہشات کی آگ کو بھڑکاتے ہیں) روک دیا ہے اُسی طرح زمانہ سابق میں ہمارے پیش رَووں نے خدا کی بخشش (یعنی بشپوں کی تقدیس) کے دروازے کو تمہاری روحانی ضروریات پر بند کر دیا تھا۔ یہ بخشش صرف کلیسیائی قوانین کے مطابق ہی مل سکتی ہے جس کی طفیل دنیا بشپوں۔ پریسٹوں اور ایمانداروں سے معمور ہو گئی ہے۔ ایسا کہ وہ اب شمار میں آسمان کے ستاروں کی مانند ہیں۔ اور خدا کے فضل سے ان کی تعداد روزانہ ترقی کر رہی ہے۔ لیکن جہاں تک تمہارے اسقفی علاقہ کا تعلق ہے جب سے تم نے کلیسیائی قوانین کے خلاف گردن کشی اختیار کی ہے، ہندوستان میں اسقفی سلسلہ رک گیا ہے۔ اور

عہ جیسا ہم باب دوم کی فصل اول میں بتلا چکے ہیں ماری پہلا شخص تھا جس نے ایران میں کلیسیا قائم کی تھی۔ (برکت اللہ)

اس میں خلل واقع ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بد قسمت ملک تاریکی میں پڑا ہے۔ کیونکہ جائز حقیقی اور برحق بشپوں کی الٰہی تعلیم کے نور سے دور ہو گیا ہے۔ یہ صرف ہندوستان کا حال ہی نہیں جو ایرانی سلطنت کی حدود سے قلعہ (-Kala.) تک ایک ہزار دو سو فرسنگ لمبا ہے بلکہ تمہارے اپنے فارس کے صوبہ کا بھی یہی حال ہے۔"

فارس کے میٹروپالیٹنوں کی مخالفت کے باوجود ہندوستان کے میٹروپولی ٹن مقرر ہوتے گئے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ پیٹریارک صلیبا ذکا (-Saliba Zacha) (از ۷۱۴ء تا ۷۲۸ء) نے ہندوستان کے ایک میٹروپولی ٹن کی تقدیس کی۔ لیکن بایں ہمہ فارس کے میٹروپولی ٹن کی مخالفت بھی بدستور سابق جاری رہی۔ چنانچہ اس واقعہ کے نصف صدی بعد بھی پیٹریارک ٹموتھی اول (-Timothy I.) (از ۷۷۹ء تا ۸۲۳ء) کو انہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جو یسوعا یحب سوم کو پیش آئی تھیں۔ شامی مورخ بارہیبریس (-Barhebraeus.) لکھتا ہے "کہا جاتا ہے کہ اس ٹموتھی کے وقت تک فارس کے اسقفی علاقہ کے بشپ، سلوکیہ کے کیتھولی کوس سے سرتابی کر کے کہتے تھے کہ ہم کو مقدس توما نے بشارت دی ہے اور ہمارا ماری کے صدر مقام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں لیکن ٹموتھی نے ان کو رام کر کے اپنے ماتحت کر لیا اور بیبار مخر شمعون کو میٹروپولی ٹن بنا کر اس کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ کیتھولی کوس کی اجازت اور تصدیق کے بغیر بشپوں کی تقدیس کر دیا کرے[۵]" اور یوں اس سالہا سال کے جھگڑے کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام ایران اور اس کے گرد و نواح کے ممالک میں نہایت سُرعت کے ساتھ پھیل گیا تھا۔ پس پیٹریارک تھیوڈوسئیس (Theodosius.) (از ۵۵۲ء تا ۵۶۶ء) کی زیرِ صدارت سنڈ نے نیکایاہ کی کونسل کے اس قاعدہ کو کہ تمام بشپ سال میں ایک دفعہ پیٹریارک کی سنڈ میں حاضر ہوا کریں، تبدیل کر کے یہ فیصلہ کیا کہ دُور دراز کے ممالک کے میٹرو پالی ٹن ہر چھٹے سال اپنی رپورٹ اور زرِ ادائگی بھیجا کریں۔ اس قرارداد کے الفاظ یہ ہیں:۔

"لیکن دیگر میٹروپولی ٹن یعنی چین۔ ہندوستان۔ فارس سمرقند کے میٹروپولی ٹن جو دُور دراز کے مقامات میں رہتے ہیں اور کوہستانی سلسلہ اور قزاقوں کے خطروں اور سمندری خطروں اور دیگر وجوہ کے باعث حاضر نہیں ہو سکتے، اُن پر واجب ہے کہ ہر چھٹے سال اپنی متابعت کا خط بھیجا کریں۔ اس کے علاوہ آبائے کلیسا کے قوانین کے مطابق پیٹریارک کے اخراجات کے لئے تمام شہروں اور قصبوں کے مسیحیوں سے حسب توفیق زرِ چندہ جمع کر کے روانہ کریں۔"

پیٹریارک یسوع یحیب سوم کے مندرجہ بالا خط میں چند امور قابلِ غور ہیں۔ اس خط سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ساتویں صدی مسیحی میں پنجاب اور ہندوستان کے طول و عرض میں متعدد بشپ اور بے شمار پریسبٹر تھے۔ ان بشپوں کے صدر مقام ہندوستان کے مختلف حصوں میں تھے، اور اس وسیع ملک میں مسیحی کلیسیائیں قریباً چار ہزار میل

کے فاصلہ تک قائم تھیں۔ اس خط میں ایک مقام "قلعہ" کا نام آتا ہے
یہ "قلعہ کا ملک" کونسا تھا؟ ڈاکٹر سنگانا کا خیال ہے کہ قلعہ سے
مراد لنکا ہے۔ ڈاکٹر یول (Dr. Yule.) کی رائے میں اس سے
مراد کوئلن ہے۔ رومی بشپ میڈلی کاٹ کا خیال ہے کہ قلعہ جزیرہ نما
ملایا کی ایک بندرگاہ تھی جس میں قلعی کی ایک کان تھی جو برتنوں کو قلعی
کرنے کے لئے دُور دراز کے مقامات میں بھیجی جاتی تھی۔ پیٹریارک مذکور
"بارہ سو فرسنگ" کا فاصلہ بتلاتا ہے۔ ایک فرسنگ سے مراد وہ فاصلہ
ہے جس کو گھوڑا پہاڑی علاقہ میں ایک گھنٹہ میں طے کرتا ہے یہ فاصلہ قریباً
سوا تین میل کا ہوتا ہے۔ اگر یہ فاصلہ اُرمز سے شروع ہو اور ساحل سے
ہوتا ہوا خلیج منار سے جفنا پٹم کے راستے خلیج بنگال سے گزر کر جزیرہ
نکوبار کے جنوب سے جزیرہ نمائے ملایا کے موجودہ پینانگ تک گنا جائے
تو یہ فاصلہ چار ہزار میل کا ہوگا۔ لیکن اگر ڈاکٹر یول کا خیال صحیح ہے اور
"قلعہ" سے مراد کوئلن ہے تو یہ فاصلہ تمام شمالی ہند پر اور جنوبی ہند
کے ساحل کی کلیساؤں کو اپنے اندر شامل کرتا ہے۔

ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ فارس کے میٹروپولیٹن پیٹریارک
کے خلاف یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ چونکہ مقدس توما رسول نے ان کی
کلیساؤں کے علاقہ میں انجیل کی بشارت دی تھی اور وہ رسول شہید کے
جانشین ہیں، لہذا وہ ایک ایسے پیٹریارک کے ماتحت نہیں ہو سکتے جس
کے علاقہ میں محض ایک مسیحی شاگرد ماری نے بشارت دی تھی اور جس
کا اختیار رسول کے اختیار کے برابر شمار نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ ۸۲۳ء تک پنجاب اور شمال مغربی ہندوستان کے مسیحی اپنے

آپ کو "مقدس توما کے مسیحی" کہتے تھے۔ لیکن اب موجودہ زمانہ میں صرف جنوبی ہندوستان کے مسیحی اپنے آپ کو "مقدس توما کے مسیحی" کہتے ہیں۔

بہرحال ساتویں صدی کے پہلے نصف میں پیٹریارک کے فیصلہ کے مطابق خاص ہندوستان کے لئے ایک الگ میٹروپولی ٹن مقرر ہوگیا جس کے ماتحت بشپ تھے جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں رہتے تھے۔ چنانچہ موری نس Morinus. لکھتا ہے:

"جس طرح رومی کلیسیا کا پوپ اپنے بشپوں کو مختلف ممالک میں بھیجتا ہے اسی طرح نسطوری پیٹریارک اپنے بشپوں اور آرچ بشپوں کو ہندوستان کے تمام حصوں میں بھیجتا ہے۔"

اس زمانہ میں خلفائے اسلام کی تلوار ایران اور دیگر مشرقی ممالک میں اپنا کام کر رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وقتاً فوقتاً مہاجرین کے گروہ شمالی ہند میں آکر مستقل رہائش اختیار کر لیتے تھے۔ یہ مسیحی مہاجرین کلیسیا کی تقویت اور ترقی کا باعث ہوتے تھے۔ پس کلیسیا نے ایسی حیرت انگیز ترقی کر لی کہ سات سو سال کے بعد یعنی چودھویں صدی میں ہندوستان کے میٹروپولی ٹن کا درجہ تمام نسطوری کلیسیا کے میٹروپولیٹنوں میں رتبہ کے لحاظ سے پندرھواں ہوگیا۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے میٹروپولیٹنوں کا صدر مقام متعین نہیں ہو سکتا۔ اور ہم کو یہ علم نہیں کہ وہ کس شہر یا صوبہ میں رہائش گزیں تھے۔ ہم کو اس بات کا بھی علم نہیں کہ ہندوستان کی کلیسیائی تقسیم کس طرح تھی اور میٹروپولی ٹن کے ماتحت جو بشپ تھے اُن کے صدر مقام کس کس جگہ تھے اور ان کے اسقفی علاقے کس طرح تقسیم کئے گئے تھے۔

قدیم رِوائت کے مطابق جب مقدس توما رسول ٹیکسلا میں تشریف فرما ہوئے تو آپ نے اپنی رہائش نزدیک کے ایک شہر گندس پور (-Gundispur.) میں اختیار کی جو موجودہ شاہ آباد کے قریب تھا۔ ۸۹۳ء میں دمشق کا میٹروپولی ٹن ایلیاس ہم کو بتلاتا ہے کہ یہ جگہ ہندوستان کے میٹروپولی ٹن کا صدر مقام تھی۔ اس مقام میں بعد کے زمانہ میں ایک بڑا مشہور طبی مدرسہ بھی قائم تھا۔ ۱۳۲۹ء میں عمرا اپنی فہرست میں اس مقام کا بھی ذکر کرتا ہے۔

بنگال اور وسط ہندوستان کی کلیسیائیں

بنگال اور گنگا کی وادی میں بھی کم از کم پانچویں صدی سے مسیحی کلیسیائیں عام طور پر پائی جاتی تھیں۔ چنانچہ کوسمس (جس کا ذکر آئیندہ آئے گا) کہتا ہے کہ اس نے ۵۲۵ء کے قریب گنگا کی وادی میں بے شمار کلیسیاؤں اور متعدد بشپوں کو دیکھا وہ کہتا ہے کہ ہندوستان کے اس گوشہ میں بے شمار گرجے۔ مسیحی راہب اور درویش رہتے تھے۔ اور ان مقامات کے مسیحیوں نے بڑی تعداد میں شہید ہو کر اپنے خون سے اپنے ایمان پر مہر استقلال ثبت کی۔ یہ نسطوری عالم ہم کو بتلاتا ہے کہ پیگو (جو برما میں واقع ہے)، کوچین چائنا۔ سیام اور ٹان کوئن (Tonquin.) میں بھی بے شمار مسیحی رہتے تھے۔

اس کے چند صدیوں کے بعد اوسورئیس (—Osorius.) اور جاری کس (-Jaricus.) ہم کو بتلاتے ہیں کہ بنگال اور وسط ہندوستان میں کلیسیائیں قایم تھیں۔ مورخ ہف (-Hough.)

کہتا ہے کہ ۱۲۲۲ء میں پٹنہ کا شہر میٹرو پولی ٹن کا صدر مقام تھا۔ مارکوپولو سیاح ۱۲۹۵ء میں کہتا ہے کہ وسط ہندوستان کے چھ راجاؤں میں سے تین راجے مسیحی تھے۔ ۱۳۷۵ء میں کٹلن نقشہ (Catalan Map.) میں لکھا ہے۔ "اس مقام میں کے سٹیفن (K. Stephen.) مسیحی حکمران تھا" یہ مقام غالباً کٹک تھا۔ ۱۴۴۲ء میں عبدالرزاق سمرقندی (جو خراسان کے بادشاہ شاہرخ مرزا جن امیر تیمور کا سفیر تھا) ہندوستان آیا۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ دکن میں بیجانگر کی سلطنت کا وزیر ایک مسیحی تھا اور شکایت کے طور پر لکھتا ہے کہ جب وہ وزیر بنا تو اس نے میرا وظیفہ جو ریاست کی طرف سے مجھے ملتا تھا بند کر دیا۔ بارتھولڈ (Barthold.) کہتا ہے کہ ۱۵۰۶ء میں بنگال میں مسیحی کلیسیائیں قایم تھیں۔ پیٹریارک ایلیاہ پنجم نے ہندوستان کے ایک میٹرو پولی ٹن کی تقدیس کی۔ ہمیں یہ علم نہیں کہ اس میٹرو پولی ٹن کا صدر مقام کونسا تھا۔ لیکن اس کی تقدیس سے کم از کم یہ ظاہر ہے کہ اس کے ماتحت کئی بشپ اور متعدد پریسبٹر اور ڈیکن اور بے شمار مسیحی تھے جو کلیسیائی تنظیم میں منظم تھے۔

فصلِ دوم

رومی کلیسیا کے اوّلین مبلغین کی آمد

بمبئی کی مسیحی کلیسیائیں	چودھویں صدی میں یورپ میں رومی

کلیسا کے دو راہبانہ سلسلے تھے یعنی فرانسسکی (Franciscan.)
اور ڈومنکی (Dominican.) جن کے ذریعہ رومی
کلیسا اُن ایام میں اپنی تبلیغی اور سیاسی مہموں کو سرانجام دیا کرتی تھی
چنانچہ ۱۳۱۹ء میں ان دونوں سلسلوں کے راہب ایوین یون
(Avignon.) سے (جو اُس زمانہ میں روم کے
پوپ کا صدر مقام تھا) مشرقی ممالک میں آئے۔ انھوں نے تبریز اور
ارمز میں رومی کلیسا کا پراپاگنڈا کیا۔ لیکن ان کو کوئی نمایاں کامیابی
نصیب نہ ہوئی۔ وہاں سے چار فرانسسکی اور ایک ڈومنکی راہب
جورڈن (Jordon) تھانہ میں پہنچے جو بمبئی کے قریب سالسٹ
کے جزیرہ میں واقع ہے۔ یہاں پندرہ نسطوری خاندان رہتے تھے۔ وہاں
ان کو معلوم ہوا کہ "سفر اور بروچ کے مقامات میں بھی متعدد مسیحی بستے
ہیں"۔ وہ بتلاتے ہیں کہ "حال ہی میں مسلمانوں کی خوف ناک ایذارسانیوں
کی وجہ سے مسیحی کلیسیائیں ہر جگہ مٹتی جارہی ہیں اور گرجاؤں کو مسجدوں
میں تبدیل کیا جارہا ہے"۔ یہ وہ مقامات تھے جو صدیوں سے کلیسیائے
نسطوری بشپ کے علاقہ میں شامل تھے اور جہاں گذشتہ ایک ہزار
سالوں سے کلیسیائیں بکثرت آباد تھیں۔ ۱۳۲۱ء میں جورڈن سفر اور
بروچ کی جانب چلا گیا لیکن چاروں فرانسسکی راہب وہیں تھانہ میں ہی
رہے۔ ابھی وہ سورت پہنچا تھا کہ اس کو خبر ملی کہ اس کے ساتھی زندان
میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ پس وہ اُلٹے پاؤں تھانہ کو واپس لوٹا۔ ابھی وہ
راہ میں ہی تھا کہ اس کو معلوم ہوا کہ وہ شہید کر دیئے گئے ہیں۔ تھانہ پر
اُن دنوں میں مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ جورڈن ہم کو بتلاتا ہے۔ کہ

"ایک گُرز مسلمان یوسف کو معلوم ہوا کہ یہ راہب تبلیغ کی خاطر آئے ہیں۔ اس نے گورنر کے پاس رپورٹ کردی جس نے راہبوں کو بلوا بھیجا اور ان سے الوہیت مسیح اور نبوتِ محمدیہ پر سوال کئے گئے۔ انھوں نے بہترا کہا کہ ہم مسیح کا پرچار کرتے ہیں اور محمد کی بابت کچھ کہنا نہیں چاہتے کیونکہ ہم اسلام کے مبلغ نہیں ہیں۔ لیکن قاضی ان سے محمد کے متعلق سوال پوچھتا گیا۔ راہبوں نے جواب دیا کہ تم ہمارے مسیحی عقیدہ سے خود معلوم کرسکتے ہیں کہ ہم محمد کی بابت کیا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن گورنر اور قاضی سچے کے سوال کرنے سے باز نہ آئے کیونکہ عام مسلمان اُن کو جان سے مار ڈالنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اس پر ایک راہب کی زبان سے محمد کے حق میں نازیبا الفاظ نکل گئے۔ پس یہ فتویٰ صادر ہوا کہ چاروں راہبوں کو بر سرِ عام آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ آگ میں جلائے جاتے مسلمان ان پر ٹوٹ پڑے اور انھوں نے ایک درخت کے نیچے ان کو شہید کردیا۔"

یہ واقعہ سنہ ۱۳۲۱ء کے مقدس ہفتہ کی جمعرات کی شام کے روز ہوا۔ ایک اور راہب پطرس ان کی گرفتاری کے وقت کسی اور جگہ گیا ہوا تھا۔ گورنر نے اس کو بھی طلب کیا اور مبارک جمعہ کے روز طرح طرح کے عذاب دے کر اس کو بھی شہید کردیا۔ یوں ہندوستان میں رومی کلیسیا کی تبلیغی کوششوں کا شروع اس کے مبلغین کی شہادت سے ہوا۔

جورڈن اپنے ساتھیوں کی شہادت کے بعد دو سال تک ہندوستان میں رہا۔ اس نے ۱۳۲۴ء میں اپنے افسر اعلیٰ کو ایک خط میں لکھا۔

"اے معزز باپ! واضح ہو کہ میں یہاں ہندوستان میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ خداوند کی یہ مرضی ہوئی کہ میرے رفیق شہید ہو جائیں اور میں اس سعادت سے محروم رہ جاؤں۔ اُن کی شہادت کے دس روز بعد میں نے نوے آدمیوں کو بپتسمہ عہ دیا۔ میں نے تھانہ میں بیس افراد کو اور سفر میں پینتیس ۳۵ لوگوں کو بپتسمہ دیا ہے۔ اس کے لئے خداوند مسیح کی حمد ہو۔ میں تھانہ کے شہر اور اس کے مضافات میں گذشتہ ۲½ سال سے اکیلا تن تنہا پھرتا رہا ہوں لیکن اس قابل شمار نہیں کیا گیا کہ اپنے مبارک ساتھیوں کی طرح شہادت کا تاج پاؤں۔ اس عرصہ میں سمندری ڈاکوؤں نے مجھے قید کیا ہے۔ مسلمانوں نے مجھے زندان میں ڈالا ہے۔ مجھ پر بدترین الزام لگائے گئے ہیں۔ ہر طرف سے مجھ پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ طعن و تشنیع کا نشانہ بنا رہا ہوں۔ مجھے صرف ایک قمیص میں ننگا پھرایا گیا ہے اور تا حال اپنے منصبی لبادہ سے محروم ہوں۔ بھوک۔ پیاس۔ سردی۔ گرمی۔ غربت۔ بیماری۔ آب و ہوا کی ناسازگاری۔ لعن طعن۔ کینہ

عہ یہ لوگ غالباً پہلے ہی مسیحی تھے اور نسطوری کلیسیا کے ممبر تھے۔ جورڈن نے ان کو پھر بپتسمہ دے کر رومی کلیسیا میں شریک کر لیا۔ (برکت اللہ)

اور غضب - گالی گلوچ - عقوبت وایذا ظلم وستم اقد دیگر بے شمار مصیبتوں کا شکار رہا ہوں۔ لیکن ان باتوں کو میں خاطر میں بھی نہیں لاتا۔ مسیح کی خاطر میں ان کو بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت آفتوں کو بلکہ موت تک کو سہنے کے لئے تیار ہوں۔ میری صرف ایک التجا ہے۔ کرم کر کے اور راہب روانہ کریں تاکہ میری محنت اکارتھ نہ جائے اور جن لوگوں کو میں نے بپتسمہ دیا ہے وہ شیطان سے محفوظ رہیں۔"

جب جورڈن یورپ کو واپس گیا تو ۱۳۲۸ء میں پوپ جان بست ودم (John XXII.) نے اس کی تقدیس کر کے کوِلون کا بشپ بنا کر جنوبی ہند بھیج دیا تاکہ نسطوری مسیحیوں کو رومی کلیسیا میں داخل کرے۔ وہاں اس نے ہزارہا نسطوری مسیحیوں کو رومی کلیسیا کا حلقہ بگوش بنا دیا۔

انہی ایام میں اٹلی کا پادری اوڈرک (Blessed Odoric of Pordenone.) آرمینیا اور ایران میں سے ہوتا ہوا تھانہ آیا۔ وہ مذکورہ بالا فرانسسکی شہیدوں کی قبروں کو کھود کر ان کی ہڈیاں اپنے ہمراہ لے گیا تاکہ شمالی ہند کی کسی خانقاہ میں عزت واحترام سے دفن کر دی جائیں۔

جان آف مارل یانوز (John of Marignola.) ۱۳۴۸ء سے ۱۳۵۰ء تک ہندوستان میں رہا وہ کوِلون آیا اور تیرہ ماہ تک مالابار میں رہ کر نینوہ اور دمشق کی راہ واپس یورپ چلا گیا۔ اس کے جانے سے رومی کلیسیا کی مساعی کا پہلا دور ختم ہوا۔

فصلِ سوم

شمالی ہندوستان کی کلیساؤں کا انجام

پنجاب۔ شمالی ہندوستان۔ بنگال اور بمبئی وغیرہ صوبوں کی کلیساؤں کا کیا حشر ہوا جو زمانۂ قدیم سے ان مقامات میں نہ صرف قایم تھیں بلکہ پھولتی پھلتی تھیں اور رُو بہ ترقی تھیں؟ کیا وجہ ہے کہ گذشتہ پانچ سو سال میں ان کلیساؤں کا نام ونشان ایسا نابود ہوگیا کہ ان کی یاد تک بھول بسر گئی ہے اور ان کے آثار صفحۂ ہستی سے مٹ گئے ہیں ؟

اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں اسلامی تاریخ کی ورق گردانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ رسول عربی ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے اور ۶۳۲ء میں وفات پا گئے۔ آپ کی وفات کے پندرہ برس بعد ۶۴۷ء میں خلیفہ عثمان کے عہد خلافت میں اسلامی افواج نے تھانہ اور بروچ پر حملے کئے لیکن یہ حملے عارضی قسم کے تھے۔ ۷۱۱ء میں قاسم نے سندھ پر حملہ کرکے وادیٔ سندھ میں قدم جمالئے گو تین سال بعد اس کی موت کے ساتھ ان اسلامی حملوں کی رَو ختم ہوگئی لیکن ایران کی فتح کے بعد ایران کی کلیسا تہ و بالا ہوگئی۔ اس کے بعد عربوں نے ہندوستان کا رُخ کیا۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ ایران ترکی سلاطین کے ماتحت ہوگیا۔ ایک ترک نے مرکزی افغانستان میں بادشاہت قایم کرکے غزنی کو دارالسلطنت

بنالیا۔ سبکتگین نے ۹۹۷ء میں راجہ جے پال کو شکست دی۔ اس کے بیٹے محمود غزنوی نے قزاق قبیلوں کو جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے ہندوستان میں لوٹ مار کرنے کی غرض سے جمع کیا اور ۱۰۰۱ء اور ۱۰۲۶ء کے درمیان سترہ حملے کر کے اپنے ساتھ اس قدر دولت لے گیا جو اس نے کبھی خواب وخیال میں بھی نہ دیکھی تھی۔ ڈیڑھ سو سال تک پنجاب اور شمال مغربی ہند محمود کے جانشینوں کے ماتحت ایک اسلامی صوبہ بنا رہا۔ اس عرصہ میں مسیحی کلیساؤں کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہ الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ زمانہ کلیسیا کی مصیبتوں کے شروع کا زمانہ تھا۔ محمد غوری کے لشکر نے اجمیر۔ دہلی اور قنوج کے راجپوت راجاؤں کو اُن کے باہمی نفاق رقابت اور تنازعہ کی وجہ سے شکست دی اور یہی تین راجپوت ریاستیں مسلمان حملہ آوروں کو شمال مغرب کی جانب سے روکا کرتی تھیں۔ تیس سال تک محمد غوری نے اجمیر۔ گوالیار۔ گجرات اور شمالی ہندوستان کو ویران کئے رکھا۔ جب ۱۲۰۶ء میں گکھڑوں نے اس کو دریائے سندھ کے کنارے خیمہ میں قتل کر دیا تو قطب الدین (جس کی یادگار قطب صاحب کی لاٹ ہے) سندھ سے لے کر دکھنی بنگال تک حکمران ہو گیا۔ خاندان غلامان کے بادشاہ اپنے پایہ تخت دہلی سے بندھیاچل کے شمال کی جانب کے تمام ہندوستان پر حکمران تھے۔ اور ان کے ماتحت صوبہ سرحد۔ پنجاب اودھ۔ بہار۔ دکھنی بنگال۔ اجمیر۔ گوالیار۔ مالوہ اور سندھ وغیرہ تھے۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت نے مسیحیوں اور مسیحی کلیساؤں پر کس قدر جبر اور سختی کی ہوگی اور ان پر کیا کیا مظالم ڈھائے ہوں گے۔ ان صدیوں کے دوران میں اُن تمام کلیساؤں پر جو اُن کے قبضہ اقتدار میں تھیں

اسلام کی شمشیر بار بار بجلی کی طرح گرتی رہی۔ سلاطین خلجی (از ۱۲۹۰ء تا ۱۳۲۰ء) بھی تعصب میں کسی اسلامی حکمران سے کم نہ تھے۔ علاؤ الدین نے ہندوؤں کا ایسا قافیہ تنگ کر دیا تھا کہ "بالفاظ مورخ" ان کو سر کھجلانے کی فرصت نہیں ملتی تھی"۔ اسلامی شرع کے قوانین ہر جگہ نافذ تھے۔ مے نوشی اور جوا بازی ممنوع تھی۔ شراب کی خرید و فروخت کرنے والوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ اس نے ہندوؤں پر جزیہ لگایا۔ کسی ہندو کو گھوڑے کی سواری یا مسلح ہونے یا نفیس کپڑے پہننے کی اجازت نہ تھی۔ ہندو اپنا سر نہ اٹھا سکتے تھے۔ اور ان کے گھروں میں سونے چاندی کا نشان بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے اشیاء کے نرخ مقرر کر رکھے تھے اور کسی کو گراں قیمت پر بیچنے کی مجال نہ تھی۔ اگر کوئی کم وزن تولتا تو اس کے چوتڑوں میں سے اُتنا گوشت کاٹ کر وزن پورا کیا جاتا تھا۔ محمد تغلق (از ۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) نہایت ظالم بادشاہ تھا جو مسلمانوں کو بھی نہیں چھوڑتا تھا۔ چنانچہ برنی کہتا ہے۔ کہ "مومنین کا قتل کرنا اس کا روزانہ شغل تھا۔" اس قسم کے سلاطین کے عہد میں کلیساؤں پہ جو بیتی ہوگی اس کا اندازہ قوتِ متخیلہ ہی کر سکتی ہے۔

چودھویں صدی تک شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اب تک مرکزی ایشیا سے تین حملوں کی لہریں آ چکی تھیں۔ پہلے غزنی کے ترکوں نے اور پھر غور کے افغانوں نے شمال مغربی ہند اور پنجاب کو تاراج کیا۔ اس کے بعد مغلوں کے حملے ہوئے۔ لیکن جب وہ سلاطینِ دہلی پر فتح نہ پا سکے تو بے شمار مغلوں نے سلاطین دہلی کے ماتحت ملازمت اختیار کر لی۔ جب ۱۲۹۲ء میں تین ہزار مغل مسلمان ہو گئے

توسلطان نے دہلی کی نواح میں ان کو جاگیریں عطا کر دیں۔ پانچ صدیوں تک مسلمان حملہ آور (جو ایرانی، افغانی۔ تورانی، ترک اور منگولی مغل کے لوگوں پر مشتمل تھے) بندھیاچل کے شمال کی طرف ہر جگہ پھیل گئے۔ انہوں نے لاتعداد ہندوؤں اور مسیحیوں کے ساتھ جبریہ شادیاں کر لیں۔ موجودہ زمانہ کے بے شمار مسلمان انہی حملہ آوروں کی اولاد ہیں اور شاذو نادر ہی ایسے ہیں جن کی رگوں میں ہندی خون نہیں ہے۔ ان صدیوں میں بے شمار ہندوؤں اور مسیحیوں نے طوعاً و کرہاً اسلام قبول کر لیا۔ بالخصوص پنجاب صوبہ جات متحدہ اور بنگال کی کلیساؤں کے لاتعداد مسیحی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے اور جنوب کی جانب دکن کے بڑے حصہ کی جن مسیحی سلطنتوں کا ذکر مارکو پولو کرتا ہے وہ سب کی سب اسلامی تلوار کا لقمہ ہو گئیں۔

۱۳۹۸ء میں تیمور لنگ نے (جس نے ایران۔ مسوپتامیہ اور افغانستان وغیرہ ممالک کی کلیساؤں کو برباد کر دیا تھا) پنجاب میں ہر مقام کو غارت کرتا ہوا اور شہروں کو تاراج کرتا عورتوں مردوں اور بچوں کو قتل کرتا ہوا ایک لاکھ ہندوؤں کو قیدی بنا کر دہلی کے قریب پہنچا۔ لڑائی کرنے سے پہلے اس نے تمام قیدیوں کو قتل کر ڈالا اور نہایت خونریز جنگ کے بعد وہ دہلی میں داخل ہوا۔ اس جگہ پانچ روز کے قتل عام کے بعد میرٹھ گیا اور وہاں کے باشندوں کو تہ تیغ کر کے ہردوار پہنچا۔ اس جگہ قتل عام کر کے جموں اور کشمیر کو گیا۔ اور وہاں آباد شہروں کو ویران کرتا ہمالیہ کے دامن کے رستے واپس مرکزی ایشیا کی جانب لوٹ گیا۔ باب سوم میں ہم بتلا چکے ہیں کہ تیمور نے کلدی کلیسیا کے مسیحی مردوں۔ عورتوں اور بچوں کو چن چن کر قتل کیا تھا۔ پنجاب اور شمالی ہندوستان، وسط ہندوستان

اور بنگال وغیرہ کی کلیسیائیں گذشتہ سات سو سال سے اسلامی حکمرانوں اور مسلمان فوجوں کے ہاتھوں پے در پے متواتر اور مسلسل طور پر کاری زخم کھانے کے باوجود بقیہ کے طور پر ہر صوبہ میں موجود تھیں۔ ہم خیال کر سکتے ہیں کہ تیمور جیسے خونخوار اور مسیحیت کے جانی دشمن نے ہر جگہ اس بقیہ کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ہوگا۔ تیمور کی افواج نے ہر جگہ مسیحیت کا نام و نشان مٹا دیا۔ بے شمار مسیحی مرد اور لاتعداد عورتیں اور بچے شہید کر دیئے گئے اور لاکھوں نے اسلام کا جوا قبول کر کے اپنی جان مال اور ناموس کو بچا لیا۔ اسلامی فتوحات محض ملک گیری پر اکتفا نہیں کرتی تھیں۔ مسلمان فاتح اپنے آپ کو اسلامی مجاہد تصور کرتے تھے۔ وہ جہاں گئے انھوں نے مندروں۔ پاٹھ شالوں۔ گرجاؤں اور مسیحی مدرسوں کو برباد کر دیا، مسیحی پرسبٹروں اور کلیسیا کے لیڈروں کو چن چن کر قتل کر دیا اور مسیحیوں کو جبریہ مسلمان بنا لیا۔ بالآخر اسلامی تلوار نے جس طرح عرب۔ ایران۔ مرکزی ایشیا۔ افغانستان۔ بلوچستان وغیرہ ممالک سے مسیحیت کا نام و نشان مٹا دیا تھا، اب اسی طرح شمالی اور وسط ہندوستان وغیرہ سے مسیحیت کے آثار مٹا دیئے۔ تمام مسیحی کلیسیائیں اور مسیحی سلطنتیں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئیں اور ہندوستان کے اس تمام خطہ سے جو بندھیاچل کے شمال کی جانب واقع ہے مسیحیت کا خاتمہ ہو گیا۔

باب پنجم

مشرقی ساحلِ کورمنڈل کی کلیسیائیں

مقدس توما کی آمد اور کلیسیا کا آغاز

ہم حصۂ اول میں بتلا چکے ہیں کہ مقدس توما رسولؑ ہندوستان کے مغربی ساحلِ مالا بار کے متعدد شہروں میں انجیلِ جلیل کا جانفزا پیغام سنانے کے بعد مشرقی ساحلِ کورومنڈل کی جانب تشریف لے گئے تاکہ آپ اپنے نجات دہندہ کا پیغام اس طرف کے بت پرستوں کو بھی سنائیں۔ آپ کی تبلیغی مساعی کی طفیل مشرقی ساحل پر متعدد کلیسیائیں قائم ہو گئیں۔ جب بت پرست ہندوؤں نے دیکھا کہ لوگ جوق درجوق اپنے آبائی مذہب کو ترک کر کے دینِ حق میں شامل ہو رہے ہیں تو انھوں نے اچانک فساد کر کے آپ کو مدراس کے قریب شہید کر دیا۔ آپ مائلاپور میں دفن کئے گئے جہاں آپ کے مزار پر آج ایک عالی شان گرجا کھڑا ہے۔

مقدس توما رسول کی شہادت سے قدرتی طور پر کلیسیا کو سخت دھکا پہنچا لیکن رسولِ شہید کے خون کا بیج بارور ثابت ہوا اور

کلیسائیں شمار میں بڑھتی گئیں۔ لیکن بت پرستوں کی آنکھوں میں وہ ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتی رہیں لہذا انھوں نے ہر ممکن طریقہ سے کلیساؤں کو بیخ و بُن سے اکھاڑنے کا تہیہ کر لیا۔ ساحل کورومنڈل کے راجے بھی بت پرستوں اور برہمنوں کے ایما پر مسیحیوں کو طرح طرح کی ایذا دیا کرتے تھے۔ ہم باب دوم کی فصل دوم میں مانک واسگر کا ذکر کر آئے ہیں جس نے شیومت کو پہلے ساحل کورومنڈل اور اس کے بعد مالابار کے ساحل میں چوتھی صدی کے اوائل میں پھیلایا تھا۔ اس شخص نے کورومنڈل کے ساحل کی کلیساؤں میں کھلبلی مچا دی اور بے شمار مسیحی اپنے منجی سے منحرف ہو کر شیومت کے پیرو ہو گئے۔ اس ساحل کے راجے چولا خاندان کے تھے، جس کا ذکر راجہ اشوک (۲۶۹ء قبل از مسیح) کے کتبوں میں بھی آیا ہے۔ یہ خاندان نہایت قدیم زمانہ سے صدیوں تک ساحل کورومنڈل پر حکمران رہا۔ اور اس کے راجے نہایت متعصب اور کٹر ہندو تھے۔ ان میں راجہ راج دیو بڑا نامی گرامی فرماں روا گزرا ہے جس نے جنوبی ہندوستان کے دیگر راجاؤں کو اپنا مطیع کر لیا تھا۔ اس نے تنجور میں ایک عظیم الشان مندر بھی بنوایا تھا جس کی دیواروں پر اس کی فتوحات کندہ ہیں۔ ان متعصب راجاؤں کی متواتر ایذا رسانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی ساحل کے بے شمار مسیحی مرتد ہو گئے اور بہت اشخاص ساحلی علاقوں سے ہجرت کر کے ملک کے اندرونی حصوں میں نقل مکانی کر گئے۔

دیرِ توما کی خانقاہ

راجاؤں اور بت پرستوں کی ایذا رسانیوں کے باوجود متعدد کلیسائیں اپنے ایمان پر برقرار رہیں۔ مقدس توما رسولِ شہید کے

مزار مبارک پر ہر سال یاتری اور زائرین ہزاروں کی تعداد میں جایا کرتے تھے۔
وہاں ایک خانقاہ بھی بن گئی جس میں راہب رہتے تھے۔ یہ خانقاہ غالباً
دوسری یا تیسری صدی کے آغاز میں بنی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کتاب
"اعمالِ توما" (جس کا ذکر ہم حصّہ اول میں کر آئے ہیں) ایڈیسہ میں لکھی گئی
تھی۔ اس خانقاہ کے پہلے راہبوں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہو گا جنہوں
نے مقدس توما یا آپ کے شاگردوں کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔

جب توما تاجر اور دیگر ایرانی مسیحی مہاجرین ۳۴۵ء میں مالابار آئے
تو کورونگلور کے ساحل پر بشپ۔ پریسبٹر۔ راہب اور مسیحی موجود تھے۔ پھر
نامعلوم مالابار کی کلیسیا کا حال ان دنوں میں کیوں ابتر اور زبون تھا؟ کیا
دونوں ساحلوں کی کلیسیائیں ہندو راجاؤں اور بت پرست برہمنوں کے
ہاتھوں متواتر ایذائیں اٹھا کر ایسی کمزور ہو گئی تھیں کہ وہ ایک دوسرے کی
مدد نہ کر سکیں اور توما تاجر اور بشپ جوزف کو مالابار کی کلیسیاؤں کی مدد
کے لئے آنا پڑا؟ یا کیا مالابار کے مسیحی مشرقی ساحل کی کلیسیاؤں سے
قطع تعلق کر چکے تھے؟ اور دونوں ساحلوں کی کلیسیاؤں میں پھوٹ پڑ گئی
تھی؟ ان سوالوں کا جواب تاریخ نہیں دیتی۔

بہرحال یہ ثابت ہے کہ اس زمانہ میں مائلاپور کی خانقاہ قایم تھی۔
۳۶۳ء سے پہلے اس خانقاہ کا صدر راہب (Abbot.)
یونن (Yonan.) تھا جس کے ماتحت دو سو راہب تھے۔
اس کے بعد صادوق (Zadoc.) اس خانقاہ کا صدر راہب
بنا۔ لیڈی سلویا ایتھیریا (Sylvia Atheria.) جو ایک
زائرہ تھی بتلاتی ہے کہ ۳۸۳ء اور ۳۸۸ء کے درمیان آرمینیا۔ ایران،

ہندوستان، حبش اور مصر سے متعدد زائرین ارضِ مقدس کی زیارت کو آیا
کرتے تھے جس سے ثابت ہے کہ ہندوستان کے مسیحی کنعان کو جاترا کے
لئے جایا کرتے تھے۔ اِسی طرح دیگر ممالک کے مسیحی مقدس توما کے مزار کی زیارت
کیلئے مائلاپور آیا کرتے تھے۔ کتاب حیاتِ بارلام و یوسفطر
(جو غالباً پانچویں صدی مسیحی کی Barlaam & Josephat.
تصنیف ہے) ہم کو بتلاتی ہے کہ جس طرح مصر میں راہب رہتے تھے اُسی
طرح ہندوستان میں بھی راہب رہتے تھے۔

چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کے اوائل میں سریانی کلیسیا
کے شامی مورخین اپنی تصنیفات میں اس خانقاہ کا ذکر کرتے وقت اس کا
نام " دیر توما " بتلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں دو صد راہب رہتے
ہیں۔ ان راہبوں میں سے بعض کے نام عربی ہیں مثلاً نعیم اور بعض کے
نام ایرانی ہیں۔ مثلاً خسرو۔ شاہ دوست وغیرہ۔ یہ مورخین ہم کو بتلاتے ہیں
کہ اس خانقاہ میں جنوبی مسوپوتامیہ سے (جو اُن دِنوں سلطنتِ ایران کا
ایک حصہ تھا) راہب زیارت کی خاطر آیا کرتے تھے۔ ٹورز کا گریگوری
(سنہ ۵۹۰ء) بھی اس خانقاہ کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے :۔

"اس شہر (یعنی مائلاپور) میں جہاں مقدس توما کی مبارک ہڈیاں دفن
ہیں ہر سال کے پانچویں مہینے تہوار کے موقعہ پر ایک میلہ لگتا ہے، جو تیس
دن تک رہتا ہے۔ اس موقعہ پر ہر حالت اور ہر درجہ کے لوگ مختلف ممالک
سے نذریں اور چڑھاوے لاتے ہیں۔"

مقدس جیروم (از سنہ ۳۴۰ء تا سنہ ۴۲۰ء) بھی ہم کو بتلاتا ہے کہ ہندوستان
ایران اور سینیا کے راہب ہر روز ارضِ مقدس کنعان میں اس کے

پاس ملاقات کی خاطر آیا کرتے تھے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں زائرین کی آمدورفت کا ایک تانتا لگا رہتا تھا اور دُور دراز کے ممالک کی کلیساؤں کے راہب اس خانقاہ کی شہرت اور رسولِ شہید کے نام کی بدولت مائلاپور بکثرت آیا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں مائلاپور ایک بشپ کا صدر مقام ہوا کرتا تھا اور متعدد پریسبٹ اور ڈیکن یہاں سکونت کرتے تھے۔ بشپ کی رہائش گاہ اور خانقاہ کے کھنڈرات اب بھی "مقدس توما کی پہاڑی" پر پائے جاتے ہیں۔ اور راقم الحروف نے بچشمِ خود دیکھے ہیں۔

نویں صدی میں مقدس توما کا مزارِ مبارک مشرق و مغرب کی کلیساؤں میں مشہور تھا۔ چنانچہ ۸۸۳ء میں انگلستان کے بادشاہ الفرڈ اعظم (-Alfred the Great.) نے شربورن کے سگھیلم (-Sighelum of Sherborme.) اور پریسبٹ اتھیلسٹن (-Athelstone.) کو ہندوستان براہِ روم بھیجا۔[۱] یہ پریسبٹ اپنے ہمراہ وہ نذریں اور تحفے لائے جو شاہ انگلستان نے لندن کے محاصرہ کے وقت مقدس توما رسول کے مزار کے لئے بطور مَنّت مانے تھے۔ وہ ہندوستان آئے اور یہاں سے ہیرے لعل و جواہرات اور خوشبودار اشیا اپنے ساتھ لے گئے۔ مقامِ افسوس ہے کہ ان دونوں پریسبٹوں نے ہندوستان کی کلیسا یا مائلاپور کے مقامی مسیحیوں کی نسبت کچھ نہیں بتلایا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی ساحل کی کلیسائیں مردِ بیمار ہی بنی رہیں۔

حق تو یہ ہے کہ سنہ ۹۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۳۰۰ء تک ہمیں ان کلیساؤں

کے متعلق کوئی خاص علم حاصل نہیں شائی لوس ڈوکسو پیٹری ادس (Nilos Doxopatrios) ۱۱۴۳ء میں ہم کو تبلاتا ہے کہ انطاکیہ کا پیٹریارک ہندوستان سے اچھی واقفیت رکھتا تھا۔ اور اس نے ایک بشپ کی تقدیس کرکے اس طرف روانہ کیا تھا، جس نے یہاں آکر اپنا نام رومو گریس (Romogyris-) اپنے صدر مقام کے نام پر رکھ لیا۔ اس مقام کا نام غالباً "رام گری" یعنی رام کا پہاڑ ہوگا لیکن ہمیں نہ تو اس جگہ کا اور نہ اس بشپ کا کوئی علم ہے۔

۱۱۲۲ء میں ایک مسیحی یہاں سے روم کو گیا تھا۔ اور وہاں اس نے اپنے آپ کو ہندوستان کا پیٹریارک یوحنا ظاہر کیا تھا۔ اس نے روم کے پوپ اور اس کے کارڈینلوں کو مائلا پور کے گرجا کے عجائبات، معجزات اور کہانیاں سنا کر دنگ کر دیا۔ لیکن یہ شخص محض ایک عیار تھا جس نے پوپ کو دھوکا دے کر اپنا اُلّو سیدھا کیا تھا۔

مائلا پور کی کلیسیا

مارکو پولو جو وینس کا سیاح تھا ۱۲۹۵ء میں لکھتا ہے:۔

"مقدس توما رسول کی لاش ایک چھوٹے قصبہ میں ہے جہاں بہت کم تاجر جاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں آمد و رفت آسان نہیں ہے۔ لیکن مسلمان اور مسیحی دونوں اس مزار کی زیارت کی خاطر جمع ہوتے ہیں۔ کیونکہ مسلمان بھی آپ کو ولی سمجھتے ہیں۔ جو مسیحی زیارت کے لئے جاتے ہیں وہ اس جگہ کی مٹی جہاں رسول شہید ہوئے تھے، اپنے ساتھ لے جاتے ہیں جس کسی کو تیسرے دن کا یا چوتھے دن کا بخار

آتا ہے وہ اس مٹی کی طفیل خدا کی قدرت سے شفا پاتا ہے۔ جو مسیحی مائلاپور کے گرجا کے منتظم ہیں وہ جنگلات کے درختوں پر قابض ہیں۔ وہ ان درختوں کے پھلوں کی گری پر گذارہ کرتے ہیں اور پانڈیا کے بادشاہی خاندان کو فی درخت ہر ماہ چار آنہ ادا کرتے ہیں ؎"

دیگر ذرائع سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہاں خرما کے درخت اور نخل کے درخت بکثرت ہوتے تھے۔ اور اس جگہ کے باشندے موتیوں کو سمندر سے نکالا کرتے تھے۔ بہرحال مارکوپولو کا سفرنامہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تیرھویں صدی کے آخر میں اس جگہ مسیحی بکثرت آباد تھے جو بت پرستی کے ریگستان کے درمیان سرسبز نخلستان کی مانند ہیں۔"

مانٹی کوردینو کا پادری جان (*John of Monte Corvino.)

سال ۱۲۹۱ء میں ایران کے شہر تبریز سے مائلاپور آیا۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے وہاں ایک سو اشخاص کو بپتسمہ دیا۔ لیکن یہ لوگ غالباً پہلے ہی نسطوری کلیسیا کے مسیحی تھے۔ وہ یہاں تیرہ ماہ رہا۔ وہ ایک فرانسسکی راہب تھا جو چین کے پہلے رومی مشن کا بانی تھا۔ ایک اور راہب مینن ٹیلس (Menentillus) نام ۱۳۱۰ء میں تھوڑے عرصہ کے لئے ہندوستان آیا وہ کہتا ہے کہ

"سب مسیحی لوگ اور وہ بھی جن کے نام مسیحی ہیں اکثر ستائے جاتے ہیں اور ان کو مسیح کے نام کی خاطر ایذائیں دی جاتی ہیں۔ یہاں کے مسیحی صاحبِ حیثیت نہیں ہیں اور تعداد میں بھی نسبتاً کم ہیں۔"

یہ راہب ہندوستان کی کسی جگہ کی تخصیص نہیں کرتا۔ قیاس یہی چاہتا ہے کہ یہ جگہ ایسی ہوگی جہاں اسلام کا یا بت پرستوں کا زور ہوگا۔ پادری اوڈورک (Blessed Odoric of Pordenone-)
ہم کو بتلاتا ہے کہ ۱۳۲۵ء میں مقدس توما کے مزار مبارک کے گرد صرف قریباً پندرہ خاندان بستے تھے جو نسطوری کلیسیا کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ وینس کا مرتد سیاح نکولوڈی کونٹی (Nicolo di Conti-) ۱۴۴۰ء کے قریب لکھتا ہے۔

"مائلا پور میں مقدس توما کا مزار ہے جہاں ایک عالی شان گرجا گھر ہے جس کے قریب ایک ہزار نسطوری مسیحی خاندان رہتے ہیں۔"

اس سیاح نے اٹلی واپس جا کر پوپ یوجین چہارم سے شہر فلارنس میں معافی مانگی تھی کیونکہ مشرقی ممالک میں سفر کرتے وقت اپنی جان کے خوف کے مارے اس نے اپنے ایمان کا انکار کر دیا تھا۔ وہ ہم کو یہ بھی بتلاتا ہے کہ جیسا ہم گزشتہ باب کی فصل اول میں بتلا چکے ہیں۔

"نسطوری مسیحی ہندوستان کے طول و عرض میں پائے جاتے ہیں اور اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جس طرح ہمارے ہاں ہر جگہ یہودی دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ صرف ایک عورت سے شادی کرتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے ایک شخص نے مجھے بتلایا ہے کہ کیتھے (Cathay-) سے بیس دن کے سفر کی دوری پر ایک ریاست ہے جہاں کا راجہ اور رعایا سب مسیحی ہیں لیکن وہ نسطوری بدعت کے

پیرو ہیں۔"

اگرچہ مائلا پور کی کلیسیا ہندو راجاؤں اور برہمنوں اور بت پرستوں کے ہاتھوں آفتیں سہنے اور تکلیفیں اٹھانے کی وجہ سے اور دیگر وجوہ کے باعث کمزور اور ننڈھال تھی اور تعداد میں روز بروز کم ہوتی جاتی تھی، تاہم وہ دلیرانہ ان متواتر مصائب کا مقابلہ کرتی رہی اور وہ اور اس کے پریسبٹ اپنے تبلیغی فرائض کو نہ بھولے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو اہل ہنود میں سے وہ کلیسیا میں قدیم زمانہ کی طرح جوق در جوق شامل نہ ہوئے لیکن اُن کے انجیل جلیل کا پیغام دینے سے ہندو مت پر تمام زمانوں کے لئے مستقل اثر پڑ گیا۔ چنانچہ گیارھویں صدی میں راما نج نے مسیحیت سے متاثر ہو کر ہندو مت کی کایا پلٹ دی۔ اس کا مفصل ذکر بابِ نہم میں کیا جائے گا۔

ساحلِ کورومنڈل کی کلیسیا کے زوال کے اسباب

ساحلِ کورومنڈل کی کلیساؤں کے زوال کے مختلف اسباب تھے۔ لیکن ان میں سب سے بڑے وہ اسباب تھے جن کا تعلق مذہب اور سیاسیات کے ساتھ تھا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ چولا خاندان کے راجہ نہایت متعصب اور کٹر قسم کے ہندو تھے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ مسیحیت اور ہندو مذہب میں باہمی تصادم پیدا ہو جائے کیونکہ ہندو مت بے شمار دیوتاؤں اور مورتیوں کو ماننے والا تھا۔ لیکن مسیحی مذہب خدائے واحد اور ایک درمیانی یسوع مسیح کا قائل، اور بت پرستی کا سخت مخالف تھا۔ پس

ہندو فلاسفہ اور برہمن اور عام ہندو مسیحیت کے پرچار کے مخالف تھے۔ اور اس کی اشاعت ان کو مطلقاً نہ بھاتی تھی۔ متعصب راجے جو کٹر ہندو تھے اور جابجا اپنی ریاست میں مندر بنوایا کرتے تھے، اور مورتی پوجا کے دلدادہ تھے، وہ بھی ہر ممکن طور پر مسیحیت کی بیخکنی کے درپے رہتے تھے۔

جب چودھویں صدی کے اوائل میں اسلام نے جنوبی ہند کی طرف رُخ کیا تو کلیسیا کی شامت آگئی۔ سلطان علاؤالدین خلجی شاہِ دہلی نے جرنیل ملک کافور کو لشکرِ جرار دے کر جنوبی ہند روانہ کیا۔ ان لڑائیوں کا سلسلہ ۱۲۹۰ء سے ۱۳۱۲ء تک جاری رہا اور ہندو راجاؤں کو پے در پے شکست ملتی رہی۔ کوئی ہندو ریاست اس طوفانی سیلاب کے سامنے قایم نہ رہ سکی۔ ملک کافور رامیشورم تک فتح کرتا چلا گیا جہاں اس نے ایک مسجد بنوائی جو جہانگیر بادشاہ کے زمانہ تک موجود تھی، اور مسجدِ علائی کے نام سے مشہور تھی۔ ان جنگوں کی وجہ سے قدیم ہندو ریاستیں تباہ و برباد ہو گئیں۔ مالِ غنیمت کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ جب مسلمانوں نے مدورا کو فتح کیا تو تین سو بارہ ہاتھی۔ بیس ہزار گھوڑے۔ تین ہزار چار سو من سونا۔ موتیوں اور جواہرات کے بے شمار صندوق اور فراواں مال ان کے ہاتھ آیا (دیکھو رسالہ سلاطینِ معبر مصنفہ حکیم سید شمس اللہ قادری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ۱۹۲۸ء)

جنوبی ہند کے راجے شاہانِ دہلی کے مطیع ہو گئے وہ جب کبھی بغاوت کرتے تو ان کی خوب سرکوبی کی جاتی تھی۔ تاہم جب بادشاہ ایک ریاست کو فتح کرتا تو دوسری میں بغاوت ہو جاتی۔ جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ اکثر صوبے باغی اور خود مختار ہو گئے۔ چنانچہ ۱۳۳۶ء میں بیجانگر کی ہندو سلطنت قایم

ہوکر فروغ حاصل کر گئی۔ ۱۳۲۵ء میں خاندانِ بہمنیہ کی اسلامی سلطنت قائم ہو گئی۔ سید حسن نے بادشاہ محمد تغلق سے باغی ہو کر کورومنڈل ساحل کے جنوبی حصہ پر قبضہ کر لیا اور وہاں ایک اسلامی "سلطنتِ معبر" کی بنیاد پڑ گئی۔ وہ چوالیس سال تک (از ۱۳۳۴ء تا ۱۳۷۷ء) مدورا میں حکومت کرتا رہا۔

مسلمانوں کی تسخیرِ ملک سے پہلے بہت سے مسلمان عراق اور عرب سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ کیونکہ مالابار کے ساحل کی طرح ساحلِ کورومنڈل میں بھی عرب اور ایران کے جہاز آیا جایا کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ممالک کے ساحلی باشندوں نے یہاں پر بھی مستقل طور پر بود و باش اختیار کر لی۔ اس ساحل کی تجارت بھی اقصائے عالم میں پھیلی ہوئی تھی اور نہ صرف عراق و خراسان بلکہ یورپین ممالک کو بھی تجارتی مال و اسباب جایا کرتا تھا۔ مسلمانوں کے تجارتی جہاز اطرافِ عالم میں جایا کرتے تھے۔ اتابک ابوبکر بن سعد زنگی (از ۱۲۲۶ء تا ۱۲۶۰ء) کے عہد میں ہر سال دس ہزار گھوڑے ساحلِ کورومنڈل آیا کرتے تھے اور ہر گھوڑے کی قیمت دو سو بیس سُرخ دینار ہوتی تھی۔ یہاں سے غیر ممالک کو نایاب موتی جایا کرتے تھے۔ ان اسباب کی وجہ سے مسلمانوں کا اقتدار روز بروز بڑھتا گیا۔ بعض مسلمان بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے' ان میں سے محمد طیبی کے دو بیٹے جمال الدین ابراہیم اور تقی الدین عبدالرحمٰن سب سے زیادہ مشہور تھے حتیٰ کہ ان کی شہرت دیگر اسلامی ممالک میں بھی پھیل گئی تھی اور عرب اور عراق کے مسلمان ان کو ملک الاسلام اور ملک الاعظم کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ چودھویں صدی کے آخر میں راجگانِ بیجانگر نے اس

اسلامی سلطنت کو فتح کر کے اپنے علاقہ میں شامل کر لیا۔

ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ جنوبی ہند میں مسلمانوں کے اقتدار اور راج کے زمانہ میں کلیسیا پر جو ہندوؤں کے ظلم و ستم کی وجہ سے پہلے ہی کمزور تھی، کیا کیا مصائب نازل ہوئے ہوں گے۔ پہلے کٹر ہندو راجاؤں کی ایذاؤں اور اب متعصب مسلمان فرماں رواؤں کی ستم رانیوں کی وجہ سے کلیسیا روز بروز نڈھال ہوتی گئی۔ فرشتہ کہتا ہے کہ علاؤالدین بہمنی مسیحیوں کا منھ تک دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ اس کے فرمان کے مطابق گرجاؤں کو مسمار کر کے ان کی جگہ مساجد بنائی گئیں۔ الغرض اسلام کے شرعی احکام کے نفاذ اور ناقابل برداشت مصائب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساحلِ کورومنڈل کی کلیساؤں کا خاتمہ ہو گیا۔ سولھویں صدی کے اوائل میں اس عظیم الشان کلیسا کا آخری نشان مائلاپور کی مزار کا بس ایک ویران گرجا رہ گیا جو ایک مسلمان فقیر کی تحویل میں تھا جو وہاں ایک دیا جلا دیا کرتا تھا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

باب ششم

مغربیِ ساحلِ مالابار کی کلیسیائیں

فصلِ اول

پانچویں اور چھٹی صدی کے حالات

اس حصہ کے دوسرے باب کی تیسری فصل میں ہم ناظرین کو بتلا چکے ہیں کہ ۳۴۵ء میں توما تاجر ایرانی مہاجرین کے ایک بڑے طائفہ کے ساتھ مالابار آیا اور اس نے اپنے مال اور رسوخ کے زور سے راجہ چیرومان پرومال سے منشور حاصل کیا جس کی رُو سے مسیحی کلیسیا کو ایسے حقوق ملے جن کی وجہ سے وہ ایک اعلیٰ ترین ذات ہو گئے۔ یہ واقعہ نیکایاہ کی کونسل کے بیس برس بعد کا ہے۔

دانی ایل پرسیٹ

اس واقعہ کے اَسّی سال بعد ہندوستانی کلیسیا کی تاریخ پر سے ایک لمحہ کے لئے پھر پردہ اٹھتا ہے۔ اس روشنی کی جھلک میں ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ کلیسیا نہ صرف زر و سیم کی دولت سے مالا مال ہے

بلکہ علم کی دولت سے بھی بہرہ ور ہے۔ اس کے خادمانِ دین انجیل جلیل اور مسیحی عقائد کے علم کی تحصیل کی خاطر ملکِ شام عہ کو سُریانی کلیسیا کے بہترین مدرسۂ دینیات میں جایا کرتے تھے اور تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر واپس مالابار آ کر لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض علم و فضل کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے اور انجیل کے بے مثل عالم تھے۔ چنانچہ جب سُریانی کلیسیا کے علماء نے انجیل جلیل کے حصص کے قدیم سُریانی ترجمہ کی نظرِ ثانی کی تو ایک ہندوستانی مسیحی فاضل نے بھی اس کارِ خیر میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اس عالم کا نام دانی ایل تھا جو پرسیٹ کے عہدہ پر ممتاز تھا۔ چنانچہ شامی عالم یسوع داد (-Isho Dad) اپنی رومیوں کے خط کی تفسیر کے خاتمہ میں لکھتا ہے:-

"اس خط (یعنی رومیوں کے خط) کو مار کومائی (-Mar Komai) نے دانی ایل ہندوستانی پرسیٹ کی مدد سے یونانی سے سُریانی زبان میں ترجمہ کیا ہے"

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی سُریانی کلیسیا کا تعلق ملکِ شام کی سُریانی کلیسیا سے نہایت گہرا تھا۔ یہ زمانہ شام کی کلیسیا کی علمی اور ادبی زندگی کے آغاز کا زمانہ تھا جس کے لئے جیسا ہم بابِ سوم میں ذکر کر چکے ہیں وہ مابعد کی صدیوں میں چاردانگ عالم میں مشہور ہوئی۔ اس کی ادبی زندگی

عہ اس رسالہ میں لفظ "شام" اور "شامی" سے ملک اور قوم مراد ہے اور لفظ "سُریانی" سے اِس ملک اور قوم کی کلیسیا اور زبان مراد ہے۔ اس طرح ان دونوں میں تمیز برقرار رکھی گئی ہے۔ (برکت اللہ)

کا شرح مشہور و معروف فلاسفر ارسطو کی تصنیفات کے ترجمہ سے ہوا تھا اور مار کوملئے اُن پہلے مترجمین میں سے تھا جنہوں نے یونانی کتب کا سریانی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ ہندوستانی کلیسیا کے لئے یہ امر فخر کا موجب ہے کہ ایسے زبردست اور بے مثل عالم کی نظرِ انتخاب اس کارِ عظیم کے لئے ایک ہندوستانی عالم پر پڑی۔ اس ایک بات سے ہم اس کے علم و فضل اور مالابار کی کلیسیا کے تلاشِ علم کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مالابار کی کلیسیا حصولِ علم کی شیدائی تھی۔ یہ ایک قدرتی بات بھی تھی کیونکہ شام کی سُریانی کلیسیا علم و فضل میں روز بروز ترقی کر رہی تھی۔ اور اس کلیسیا کے مبلغین جس ملک میں بھی گئے انھوں نے علم و فضل کی اشاعت میں ہر ممکن کوشش کی۔

مالابار کی نسطوری کلیسیا کا علمی ذوق

جب ملکِ شام اور ایران کی کلیساؤں نے نسطوری عقائد کو اختیار کر لیا تو ان کا علمی شوق اور کتاب مقدس کے مطالعہ کا ذوق آگے سے بھی تیز ہو گیا۔ ہم بابِ سوم میں بتلا چکے ہیں کہ نسطوری کلیسیا کو کس قدر شدید عقوبتوں اور اذیتوں کا سالہا سال تک مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے ایمان کے استقلال کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ اس نے کتاب مقدس کے مطالعہ کے لئے متعدد مدرسے کھول رکھے تھے اور بچوں اور جوانوں کی دینی اور دنیاوی تعلیم کا خاص انتظام کر رکھا تھا جس ملک میں بھی یہ کلیسیا گئی وہاں اس نے دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ کتابِ مقدس کے مطالعہ اور دینیات کی تعلیم پر بھی زور دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کلیسیا اپنا رسائیوں کے باوجود ہر جگہ زبردست

اور مضبوط ہو گئی۔ اس کے ابتدائی اور پرائمری سکول ہر جگہ موجود تھے۔ ہر بشپ کے صدر مقام میں اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسے اور کالج ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں مصری کلیسیا کی طرح نسطوری کلیسیا نے ہر نگر کی جگہ میں خانقاہیں قایم کر رکھی تھیں، جہاں راہب۔ راہبات اور درویش ہزاروں کی تعداد میں شب و روز دعا۔ عبادت اور روزہ میں مصروف رہتے تھے۔ ان خانقاہوں میں مبلغین بھی تیار کئے جاتے جو انجیل کا جانفزا پیغام ہر جگہ سنایا کرتے تھے۔ گذشتہ باب میں ہم ذکر کر چکے ہیں، کہ مشرقی ساحلِ کورومنڈل کی کلیسیا میں "دیرِ توما" کی خانقاہ تھی۔ اس میں بھی مبلغین تیار کئے جاتے تھے جو غیر مسیحیوں کو انجیل کا جانفزا پیغام دیتے تھے۔ مغربی ساحلِ مالابار کی کلیسیاؤں میں بھی علم و فضل کا جو شوق ہم کو نظر آتا ہے وہ سریانی اور ایرانی کلیسیاؤں کی طفیل ہے جس کی وجہ سے خدا کے فضل سے مالابار میں عالم بے مثل پیدا ہو گئے تھے عہ

ایڈیسہ کے مدرسۂ دینیات کا ایک عالم مَعنا (Mana.) روردشیر کا بشپ تھا۔ اس نے سنہ ۴۷۰ء میں پہلوی زبان میں مذہبی مکالمات اور کتبِ دینیات لکھیں۔ اس نے مسیحی گیت، منظوم مناجاتیں اور غزلیں تصنیف کیں۔ چونکہ پنجاب اور شمالی ہندوستان کی کلیسیائیں اس زمانہ میں روردشیر کے بشپ کے ماتحت تھیں، قیاس یہی چاہتا ہے کہ اس نے اپنی تصنیفات کو ان کلیسیاؤں میں ضرور بھیجا تھا جس سے ان کلیسیاؤں کو روحانی قوت اور تازگی حاصل ہوئی۔ اس فاضل بشپ نے ڈایوڈور (Diodore.) اور نسطوری خیالات کے بانی موپ سوالیسٹیا کے تھیوڈور کی یونانی تصنیفات کا یونانی سے سریانی زبان میں ترجمہ کیا۔ مورخ لکھتا ہے۔ کہ

عہ چنانچہ مقدس خرسستم (۳۴۷ء تا ۴۰۷ء) لکھتا ہے کہ انجیل یوحنا کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں کیا گیا تھا اور ہندی علما اس انجیل کے عقائد پر فلسفیانہ بحث کیا کرتے تھے۔

"اس نے ان تمام کتابوں کی نقلوں کو بحرین اور ہندستان بھیجا"۔[1]

اِن الفاظ سے ظاہر ہے کہ سُریانی کلیسیا کے ایرانی اور شامی علماء کی طفیل پنجاب۔ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے دونوں ساحلوں کی کلیسیائیں ان ایام میں علم و ادب کے زیور سے آراستہ۔ اور منطق و فلسفہ سے پیراستہ ہو کر اس قابل ہو گئی تھیں کہ انجیل جلیل کا پیغام عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعہ اپنے ہموطنوں تک پہنچا دیں۔ اور بالخصوص مالابار کی کلیسیا میں ایسے جید عالم موجود تھے جن کو انجیل کے علم اور زبان میں بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔

کوسمس سیاح ہند

چھٹی صدی کے اوائل میں ۵۲۲ء کے قریب ہندوستانی مسیحیت پر سے پھر ایک بار پردہ اٹھتا ہے اور تاریخ کی روشنی کی ایک ہلکی سی کرن کے اجالے میں ہم کو نظر آتا ہے کہ ہندوستانی کلیسیا ہر لحاظ سے روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ کوسمس ر — Cosmas. شہر سکندریہ کا ایک بڑا مالدار تاجر تھا جو کئی جہازوں کا مالک تھا۔ وہ ان میں جا کر بحر ہند کے ارد گرد کے ممالک کے ساتھ تجارت کیا کرتا تھا۔ یہ تاجر نہایت ذی علم شخص تھا اور جہاں کہیں جاتا تھا وہ اُس ملک اور قوم کے خیالات، دستورات اور دیگر حالات سے واقفیت حاصل کرنے کی از حد کوشش کیا کرتا تھا۔ وہ ایک زبردست جغرافیہ دان ہونے کے علاوہ حیوانات اور نباتات کا ماہر بھی تھا۔ وہ صاحب علم تو تھا لیکن اس کے دماغ میں یہ خبط سما گیا تھا کہ کُرۂ زمین اُس یہودی خیمہ کے نمونہ پر بنی ہے، جو بیابان میں تھا پس وہ مستطیل شکل کی ہے اور اس کی لمبائی نذر کی روٹیوں کی میز کے نمونہ کے مطابق چوڑائی سے دُگنی ہے۔ جب وہ حصولِ دولت

سے اکتا گیا اس نے دنیا کو ترک کر کے ایک خانقاہ میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ وہاں اِس نسطوری عالم نے ۵۳۵ء اور ۵۵۰ء کے درمیان یونانی زبان میں اپنی سیر و سیاحت کے احوال کو بارہ ضخیم جلدوں میں سپرد قلم کیا اور کتاب کا نام "مسیحی جغرافیۂ عالم" (Universal Christian Topography.) رکھا۔ اس میں کتاب مقدس کی آیات کو توڑ مروڑ کر تاویلیں کر کے اس نے اپنے مندرجہ بالا غلط نظریہ کو ثابت کرنا چاہا جس کی وجہ سے ایک صاحب نے اِس کتاب کا نام "و کیچڑ کا بڑا انظم" رکھا ہے۔ گو اس کے دلائل غلط ہیں لیکن اس کے چشم دید واقعات کی صحت میں کسی کو شک نہیں ہوا۔ ان واقعات میں سے ایک کا تعلق کلیسائے ہندوستان کے ساتھ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے ۵۲۲ء کے قریب ایک بحری سفر ہندوستان کی جانب اختیار کیا۔ اور بمبئی، مالا بار اور لنکا کی کلیسیاؤں کی نسبت لکھتا ہے:-

"ہم نے یہ دیکھا کہ کلیسیا کہیں بھی تباہ یا خستہ حال نہیں ہے۔ بلکہ ان ممالک کی کلیسیائیں جابجا وسیع پیمانہ پر قایم ہیں اور تمام دنیا مسیح کی تعلیم سے معمور ہو گئی ہے۔ انجیل روز افزوں ترقی پر ہے اور اس کی منادی تمام دنیا میں ہو گئی ہے۔ اس بات کا مشاہدہ خود میری آنکھوں نے کیا ہے اور میرے کانوں نے خود دوسروں سے اس کے متعلق سنا ہے۔ میں سچائی کی گواہی دینے کی خاطر یہ بیان کرتا ہوں۔ بحرِ ہند میں ایک جزیرہ ترپوبین (لنکا) ہے۔ وہاں بھی مسیحی کلیسیا موجود ہے اور خادمانِ دین اور ایمانداروں کی جماعت موجود ہے۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس ملک کے پرے بھی مسیحی پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ یہی حال اس ملک کا ہے جس کو میل (مالا بار) کہتے ہیں جہاں مرچیں پیدا ہوتی ہیں۔ کلیان کی سرزمین میں ایک بشپ رہتا ہے جس کی تقدیس عموماً ایران میں کی جاتی ہے۔"

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کوسمس کی گواہی نہایت معتبر ہے۔ وہ نہ صرف خود صاحب علم تھا بلکہ ایران کے نسطوری پیٹریارک کا دوست بھی تھا۔ پس کلیسیائی نظام اور امور کو جاننے اور پرکھنے کی اہلیت بدرجۂ احسن رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ عینی شاہد ہے اور اُن باتوں کی نسبت لکھتا ہے جو اس کے تجربہ میں آچکی تھیں۔ جس کلیان کا ذکر وہ کرتا ہے اس کے متعلق سر ولیم ہنٹر کہتے ہیں کہ مغربی ساحل کا بمبئی سے لے کر کوئلن تک کلیان نام تھا۔ بشپ کا صدر مقام کلیان تھا جو موجودہ بمبئی کے پاس ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں ساتویں صدی میں پارسیوں کے آباواجداد اسلام کی تلوار سے بچنے کی خاطر نقل مکانی کر آئے تھے۔ پس کلیان چھٹی صدی میں مسیحیت کا زبردست مرکز تھا جہاں کا بشپ ایران کے پیٹریارک کے ماتحت تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایرانی تجارت نے (جو خلیج فارس سے ہوتی تھی) رومی تجارت پر (جو بحرِ احمر کے ذریعہ ہوتی) قبضہ کرلیا تھا۔ کلیان وہی جگہ تھی جہاں جیسا ہم بابِ چہارم کی دوسری فصل میں بتلا چکے ہیں۔ بعد کے زمانہ چودھویں صدی کے اوائل میں پہلے رومی مبلغین آئے تھے۔

مورخ فشر ہم کو بتلاتا ہے کہ کوسمس کلکتہ کی کلیسیا کا ذکر کرکے کہتا

ہے کہ اس نے کلکتہ میں بھی کلیسا کو اچھی حالت میں پایا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسطوری کلیسیا کے مبلغین چھٹی صدی میں نہ صرف پنجاب شمالی ہند، مغربی ہند اور جنوبی ہند میں پھیلے ہوئے تھے بلکہ مشرقی ہند میں بھی کلکتہ تک پائے جاتے تھے۔ اور بنگال کی وادی میں جیسا ہم باب چہارم کی پہلی فصل میں لکھ آئے ہیں بے شمار کلیسیائیں اور متعدد بشپ تھے جن کو کوسمس نے خود دیکھا تھا۔

ایک اور مقام پر کوسمس لنکا کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"یہ بڑا جزیرہ سمندر میں ہے اور بحر ہند میں واقع ہے۔ اور مرچوں والے ملک (مالابار) کی دوسری جانب ہے۔ اس میں ایرانی مسیحیوں کی ایک کلیسیا ہے جو وہاں آکر بسے ہیں۔ ان میں ایک پرسبٹر ہے جو ایران سے مقرر ہوا ہے اور ایک ڈیکن بھی ہے۔ عبادت کا کلیسیائی انتظام اور پورا سامان ہے۔ لیکن وہاں کے اصلی باشندے اور بادشاہ الگ نسل اور دوسرے مذہب کے ہیں۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لنکا کی ایرانی جماعت (جو غالباً تاجروں پر مشتمل تھی) لنکا کے باشندوں میں تبلیغی فرائض کی جانب سے غافل تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہاں کوئی دیسی کلیسیا اس وقت موجود نہ تھی۔ لیکن اگلی صدی میں اس کوتاہی کی تلافی ہو گئی جب نسطوری مبلغین وہاں دیسی کلیسیائیں قائم کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ چنانچہ لنکا کی اس قدیم کلیسیا کے وجود کا ایک تازہ ثبوت وہ صلیبیں ہیں جو محکمۂ آثارِ قدیمہ نے حال ہی میں کھود نکالی ہیں۔ راقم الحروف نے فروری ۱۹۲۷ء میں لنکا کے شہر کولمبو میں بشپ

ڈی میل کے گھر میں ایک جریہ دیکھا جو کسی قدیم صلیب کا اتارا ہوا ہے۔ بشپ صاحب موصوف نے اس صلیب کی ایک عکسی تصویر مجھے بھیجی ہے جو میرے پاس محفوظ ہے۔

مسیح کی ذات کی نسبت بحث

سطور بالا میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ سریانی کلیسیا نے کلیسیائے ہندوستان کو اپنے علم و فضل کے خزانوں سے معمور کر دیا تھا اور ان میں تحصیل علم کا شوق اور دینیات کا ذوق پیدا کر دیا تھا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسیائے ہند میں علماء کا ایک گروہ وجود میں آگیا جو نہ صرف کلیسیائی عقائد اور مسیحی فلسفہ کی تشریح و توضیح کر سکتا تھا بلکہ اس قابل بھی تھا کہ ان عقائد پر غور و خوض کر کے مختلف دلائل و براہین کے حسن و قبح کی تنقید کر کے اور ان کی تنقیح کر کے ان پر مدلل بحث کر سکے۔ چھٹی صدی کے پہلے نصف میں ان مسیحی کلیساؤں میں جو ساسانی اور بازنطینی حکومتوں کے زیر سایہ رہتی تھیں خداوند مسیح کی ذات کے متعلق زبردست بحث چھڑ گئی۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ ہندوستان کے بے شمار مسیحی اس بحث میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ شامی مورخ مائیکل (-Michael the Syrian.) بیان کرتا ہے کہ جب سیویرس (-Severus.) انطاکیہ کا موقوف اسقف[ع]

ع یہ فرقہ مسیح خداوند کی وحدت فطرت کا قائل تھا۔ وہ نسطوری عقائد کا جانی دشمن تھا اور ان کی ضد میں وہ مسیح کی واحد فطرت کی غلطی میں مبتلا ہو گیا۔ (برکت اللہ)

پیٹریارک (—Monophysite Patriarch.) کا لقب
ہیلی کارنسس کے جولین Julian of Halicarnassus.
کی بدعت نے ہندوستان کی چند کلیساؤں میں دخل
حاصل کر لیا تھا۔ اور وہ جوش و خروش سے مسیح کی ذات اور شخصیت کے متعلق
بحث کیا کرتی تھیں ۴۴۔

فصلِ دوم

نسطوری الواح اور صلیبیں

مائلاپور کی لوح اور صلیب

کوسمس سیاح کو ہندوستان آئے ایک صدی سے زائد عرصہ ہو گیا ہے۔ اس مدتِ مدید میں تاریخ کی روشنی کی کوئی کرن ہندوستان کی کلیسا پر نہیں پڑتی۔ ہم کو یہ معلوم نہیں کہ نسطوری کلیسا کے مبلغین مالابار کے ساحل سے کتنی دور ملک کے اندرونی حصوں میں مسیحیت کا نجات بخش پیغام دینے کے لئے نکل گئے تھے لیکن ساتویں یا آٹھویں صدی میں جب تاریکی پر سے پردہ اٹھتا ہے تو تاریخ کی روشنی کی جھلک میں ہمیں مشرقی ساحلِ کورومنڈل پر مدراس کے قریب کی مسیحی کلیسائیں پھلتی پھولتی نظر آتی ہیں جن کا ذکر ہم بابِ پنجم میں کر آئے ہیں

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نسطوری مسیحی تاجر ساحلِ مالابار کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کر چکے تو انہوں نے مشرقی ساحلِ کورومنڈل کا

رُخ کیا۔ چونکہ مائلاپور دریا کے دہانہ پر واقع تھا اور یہاں مقدس توما کا مزار مبارک اور بیت توما کی خانقاہ موجود تھی اُنھوں نے اس تجارت کی خاطر اس مقام کو اپنی جائے رہائش بنایا تاکہ کورومنڈل ساحل کے زبردست پلوؤں کی سلطنت کے ساتھ تجارت کا رشتہ قائم کریں۔ یہاں کی مسیحی کلیسیائیں ان راجاؤں کے ہاتھوں ایذائیں بھی اٹھاتی تھیں۔ پس نسطوری مبلغین بھی ان تاجروں کے ہمراہ ہوئے تاکہ ان کلیسیاؤں کی تقویت اور روحانی تازگی کا باعث ہو سکیں۔

تاریخ کی یہ جھلک ساتویں یا آٹھویں صدی کے واقعات پر کس طرح پڑی؟ یہ ایک نہایت دلچسپ داستان ہے۔ ۱۵۴۷ء میں جب پرتگیز جنوبی ہند میں برسرِ اقتدار تھے ان میں سے بعض مدراس کے قرب وجوار میں گئے۔ انھوں نے یہ سنا تھا کہ اس جگہ کسی زمانہ میں مسیحی کلیسیا قائم تھی لیکن اب وہاں ہر جگہ بت پرستی کی تاریکی تھی۔ پس انھوں نے یہ ٹھان لیا کہ اس مقام پر از سرِ نو انجیل کی بشارت دیں۔ قریب کی ایک پہاڑی پر (جس کا نام مقدس توما کی پہاڑی ہے) کھنڈرات اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ کسی زمانہ میں وہاں ایک گرجا گھر کھڑا تھا۔ پس انھوں نے ارادہ کیا کہ اُسی مقام پر دوبارہ گرجا تعمیر کیا جائے۔ جب انھوں نے بنیادیں کھدوائیں تو گرانیٹ کے پتھر کی ایک تختی یا لوح ملی جو قریباً تین فٹ چار انچ مربع تھی۔ اس پر کسی غیر معلوم زبان کے حروف اور نقش ونگار کھدے ہوئے تھے۔ جب اس کو صاف کیا گیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس پر ایک یونانی صلیب کا اُبھرا ہوا نقش تھا جس پر ایک تراشی ہوئی صلیب کے نشیب وفراز بعینہ موجود تھے۔ صلیب کے دونوں بازوؤں کا سرا

سہ گوشہ ڈھنگ کا بنا ہوا اور آراستہ تھا۔ صلیب کے اوپر ایک فاختہ (جو روح القدس کا نشان ہے) منڈلا رہی تھی۔ ان نقش ونگار کے گرد ایک کتبہ تھا جو دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک چھوٹی صلیب دونوں حصوں کو جدا کرتی تھی یہ لوح تا حال موجود ہے۔ عہ مقدس توما کی پہاڑی پر جو گرجا تعمیر کیا گیا ہے اس کی قربان گاہ کے پیچھے دیوار میں نصب ہے۔ اس کا کتبہ بھی من وعن محفوظ ہے۔ یہ پہلوی زبان میں لکھا ہے جو مملکت ایران میں ساسانی خاندان کے بادشاہوں کے زمانہ میں رائج تھی۔ ڈاکٹر برنل کا (Burnell جو انڈین سول سروس کے تھے) یہ خیال ہے کہ یہ لوح ساتویں یا آٹھویں صدی کی ہے۔

لوح کا کتبہ

اس لوح کے متعدد اور مختلف ترجمے کئے گئے ہیں۔ مغرب کے مصنفین بالعموم ڈاکٹر برنل کا ترجمہ قبول کرتے ہیں جو حسب ذیل ہے:-

(پہلا حصہ) اس (یعنی مسیح) کے دکھ ہماری سزا کی وجہ سے صلیب پر ہوئے۔

(دوسرا حصہ) یہی سچا برحق مسیح ہے جو خدائے برتر اور پاک ہادی (یعنی روح القدس) ہے۔

اگر یہ ترجمہ صحیح ہے تو خاص ہندوستان کی نسطوری کلیسیا ایک ایسے عقیدہ پر ایمان رکھتی تھی، جو جہاں تک ہمیں علم ہے کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ اس عقیدہ کے مطابق مسیح خدا باپ بھی ہے اور روح القدس بھی ہے۔ اگرچہ جس ترتیب سے اقانیم ثلاثہ کے نام لئے گئے ہیں وہ انجیلی ہے (۲ کرنتھی ۱۳: ۱۴) لیکن یہ عقیدہ ہرگز انجیل کے مطابق نہیں۔ کیونکہ

عہ دیکھو مقابل کے صفحہ کی تصویر

PERSIAN CROSS IN CHAPEL ON ST THOMAS'S MOUNT

PERSIAN CROSS IN OLD CHURCH AT COTTAYAM

اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف کلام ہی مجسم نہیں ہوا بلکہ باپ اور روح بھی یعنی اقانیم ثلاثہ یسوع مسیح میں مجسم ہوئے تھے۔ یہ عقیدہ باقی نسطوری کلیسیا کا عقیدہ نہیں تھا کیونکہ وہ نیکایاہ کے عقیدہ پر ایمان رکھتی تھی اور تثلیث کی قائل تھی۔ بہرحال اگر یہ ترجمہ صحیح ہے تو نسطوری کلیسیا کی ہندوستانی شاخ ایسی بدعتی تعلیم کی پیرو تھی جس کا ہمیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ اس بدعت کی وجہ سے نہ تو نسطوری کلیسیا نے اور نہ کسی اور کلیسیا نے اور نہ کلیسیائے جامع نے ہندوستان کی کلیسیا کو کبھی خارج کیا اور نہ ہندوستانی کلیسیا کے رسولی سلسلہ میں کبھی کسی قسم کا فرق پڑا۔ ان وجوہ کی بنا پر راقم السطور کی رائے میں ڈاکٹر برنل کا ترجمہ ناقابل تسلیم ہے۔

یہ کتبہ جو پہلوی حروف عہ میں ہے حسب ذیل ہے:۔

م ورا م ن م س ی خ ا اپ د خ س ا ی

م د م اپ ر ا س ی چ ہ ا ر ب و ح ت + ی

س و ر ی ی ا م ن و ب و ر ی ت د ن ہ

پہلوی زبان میں یہ کتبہ حسب ذیل ہوا۔

خدائے من مسیحا اَبخشائے ابر افراسِ چہار بخت +

عہ پہلوی زبان اسلامی زمانہ سے قبل ایران کی زبان تھی۔ موجودہ فارسی زبان اسلامی تاثرات کے ماتحت عربی کے حروفِ تہجی میں لکھی جاتی ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں پہلوی زبان ارامی زبان (جو خداوند مسیح کی زبان تھی) کے حروفِ تہجی میں لکھی جاتی تھی۔ مندرجہ بالا اردو حروف ارامی حروف کی حرف بحرف نقل ہیں۔ (برکت اللہ)

سوریا کہ بریت ایں

موجودہ فارسی میں یہ عبارت حسب ذیل ہو گی:۔

خدائے من مسیحا بخشائے پرافراس چہار بخت سوریا کہ بُریداِیں۔

جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"اے میرے خدا مسیحا۔ تو چہار بخت کے بیٹے افراس سُریانی کو بخش دے جس نے اس کو تراشا ہے"

اس عبارت میں لفظ "افراس" نام ہے اور اس کا مصدر افراستن یا اوراستن بمعنی اونچا کرنا ہے۔ لفظ "سوریا" یعنی سُریانی سے مراد شامی نسل یا ملکِ شام کا فرد نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ افراس سُریانی کلیسا کا ممبر تھا۔

یہ عبارت محراب کے گرد دو غیر مساوی حصوں میں ایک چھوٹی صلیب کے ذریعہ جدا کر دی گئی ہے۔ پہلے حصہ کے آٹھ الفاظ محراب کے بالائی حصہ سے اس چھوٹی صلیب کے بائیں طرف کی جانب اس طور سے لکھے ہوئے ہیں کہ الفاظ "اے میرے خدا مسیحا" نمایاں ہیں اور محراب کے بالائی حصہ میں الفاظ "میرے خدا" اور "مسیحا" ایک دوسرے کے توازن کو قائم رکھتے ہیں۔ دوسرے حصے کے پانچ الفاظ اس چھوٹی صلیب کے داہنی طرف سے شروع ہو کر محراب کے نیچے کی جانب کندہ کئے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا ترجمہ ڈاکٹر ونکورشٹھ نے کیا ہے۔ اور راقم الحروف کے خیال میں یہی ترجمہ صحیح ہے۔

یہی عبارت تین اور صلیبوں پر کندہ ہے (جن کا ذکر اگلے صفحہ پر کیا جائیگا)

جو کئی صدیاں بعد بنائی گئی تھیں۔ ونکوورتھ کے خیال میں بعد کی صلیبوں کی عبارت کی کھدائی ظاہر کرتی ہے کہ ان کے تراشنے والے پہلوی زبان اور حروف دونوں سے ناآشنا تھے۔ اور ان حروف کے کھودنے والے بغیر سوچے سمجھے مقدس توما کی پہاڑی والی لوح کی بابت خیال نقل کرتے گئے کہ شاید یہ کوئی متبرک الفاظ ہیں۔ یا کوئی فارمولا ہے جو صلیب کی دیگر آرائش و زینت دینے والی باتوں سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

یہ لوح جیسا ہم کہہ چکے ہیں، ساتویں یا آٹھویں صدی کی ہے۔ اور ثابت کرتی ہے کہ کورومنڈل ساحل کی کلیسیائیں اس زمانہ میں ایک حقیر اقلیت ہونے کے باوجود ترقی کی راہ پر گامزن تھیں۔ لیکن جیسا ہم گذشتہ باب میں بتلا چکے ہیں مشرقی ساحل کی جانب مسیحیت کو وہ رونق اور ترقی نصیب نہ ہوئی جو اس کو توما تاجر کے آنے سے مغربی ساحل میں ہوئی تھی۔ اس ریاست کے راجاؤں اور سرکردہ لوگوں نے مسیحی کلیسیا کے ساتھ دوستانہ تعلقات کبھی پیدا نہ کئے اور نہ اس کو کبھی کوئی حقوق ملے۔ لہذا مائلا پور کا نسطوری مشن مقدس توما رسولِ شہید کے مزار مبارک کی موجودگی کے باوجود بہت کامیاب نہ ہوا۔

ریاست ٹراونکور کی الواح اور صلیبیں

ساحل مالابار کی ریاست ٹراونکور میں تا حال چار تختیاں پائی گئی ہیں، جو مائلا پور کی لوح اور صلیب کے مشابہ ہیں۔ ان الواح پر صلیبیں تراشی ہوئی ہیں اور جیسا ہم اوپر کہہ چکے ہیں ان پر بھی پہلوی حروف کی عبارت کھدی ہوئی ہے۔ یہ چار تختیاں ذیل کے مقامات میں موجود ہیں:۔

(۱) دو صلیبیں شہر کوٹیم کے جیکو بائٹ گرجا میں (جو دکھنی مسیحیوں کا ہے) موجود ہیں۔ اس گرجا کو ولیا پلی یعنی بڑا گرجا کہتے ہیں۔

(۲) مٹاچیرا میں رومی کلیسیا کے گرجا میں ایک صلیب موجود ہے۔ یہ گرجا "شمالی مسیحیوں" کا ہے۔ کتبہ کے مطابق یہ صلیب ۱۵۸۰ء میں نصب کی گئی تھی۔

(۳) کڈامٹم کے جیکو بائٹ گرجا میں ایک صلیب موجود ہے۔ یہ گرجا بھی "شمالی مسیحیوں" کا ہے۔ ڈاکٹر ونکورتھ کا خیال ہے کہ اس صلیب کی عبارت بھی وہی ہے جو کوٹیم کی بڑی لوح پر کندہ ہے اگرچہ تراشنے والے کی پہلوی زبان سے لاعلمی کے باعث یہ عبارت کسی دوسری زبان کی معلوم ہوتی ہے[۷۶]۔

ان چار صلیبوں کے علاوہ تین اور صلیبیں ہیں جو اصل صلیبوں کی نقل ہیں۔ ان میں سے دو صلیبیں کڈوتوروتی کے ولیا پلی گرجا میں ہیں جو ۱۶۱۴ء یا ۱۶۱۵ء میں بنائی گئیں۔ تیسری صلیب جو مٹاچیرا گرجا کے باہر ہے، ماٹلاپور کی صلیب کی نقل ہے۔ اور ۱۶۲۳ء میں بنائی گئی تھی۔

مٹاچیرا اور کڈامٹم کی صلیبیں کوٹیم کی چھوٹی صلیب کے قریباً برابر ہیں۔ اور ۲×۲ فٹ ہیں۔ ایک روایت کے مطابق کڈامٹم کا گرجا پہلے پہل بشپ مار آبو نے ۸۲۳ء میں تعمیر کیا تھا اور اس نے وہاں کی صلیب بھی نصب کی تھی اور صلیب پر کا کتبہ بھی اسی کا ہے۔ لیکن اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس روایت میں کہاں تک صداقت ہے۔

گودیہ (-Gouvea.) اپنی کتاب جورناڈا (-Jornada.) میں یہ بھی کہتا ہے۔ کہ " ان مسیحیوں کے

قدیم گرجے ہندوؤں کے مندروں کی طرز پر بنائے گئے تھے اور ان سب میں مالاپورگی صلیب کی سی صلیبیں تھیں جو یا تو تراشی جاتی تھیں اور یا منقوش تھیں ۔

لیکن موجودہ زمانہ میں ہم کو کسی گرجا گھر میں بھی کوئی منقوش صلیب نہیں ملتی ۔ ممکن ہے کہ امتداد زمانہ کے باعث ان منقوش صلیبوں کے نقش اب مٹ گئے ہوں ۔

کوٹیم کی صلیبیں اور الواح

مغربی ساحل مالابار کے شہر کوٹیم کے دلیاپلی گرجا میں جو دو صلیبیں موجود ہیں وہ خاص اہمیت رکھتی ہیں ۔ لہذا ان کا مفصل بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ دلیاپلی کا گرجا قدیم کوٹیم میں واقع ہے جہاں اب سے دو سو سال پہلے تیکم کور راجہ کا محل واقع تھا ۔ یہاں ایک قلعہ بھی تھا جس کی فصیل میں سات برج تھے اور چوگرد خندق تھی ۔ اس قدیم شہر میں ایک عالی شان مندر تھا اور چھاؤنی بھی تھی ہندوؤں مسلمانوں اور مسیحیوں کے رہائشی مکانات اور دکانیں بھی تھیں ۔ اس جگہ ایک پرانی مسجد ۔ متعدد گرجے اور مندر تھے ۔ یہ سب چیزیں تین میل کے رقبہ میں واقع تھیں ۔

دلیاپلی کا موجودہ گرجا جس میں یہ دو صلیبیں واقع ہیں تقریباً چار سو سال پرانا ہے اور پہلے پہل سنہ ۱۵۵۰ء میں لکڑی کا بنایا گیا تھا ۔ موجودہ پتھر کی عمارت اس کے "ستر" سال بعد شروع ہوئی ۔ تہہ زمین سے یہ گرجا بہت اونچا ہے اور وہاں جانے کے لئے سیڑھیاں ہیں ۔ یہ سیڑھیاں اور محرابی دروازہ سنہ ۱۸۹۱ء میں بنے ۔ ان سیڑھیوں پر پرانے زمانہ کی متعدد

الواح قبور گڑی ہوئی ہیں تا کہ گرجا گھر میں آنے جانے والوں کے پاؤں ان پر پڑیں۔ اس گرجا کی دونوں صلیبیں غالباً کرنگا نور کے قریب کے کسی قدیم گرجا سے لائی گئی تھیں، اور مائلا پور کی صلیب کی سی ہیں۔ یہ دونوں الواح گرجا کی چانسل کے دائیں اور بائیں طرف کی دیواروں میں زمین سے قریباً ۴ فٹ کی اونچائی پر نصب ہیں۔ دائیں طرف کی لوح قد میں مائلا پور کی لوح کے برابر ہے اور اس پر بعینہ وہی الفاظ کندہ ہیں جو مائلا پور کی لوح پر ہیں۔ دونوں میں محراب گول ہے۔ لیکن بائیں طرف کی لوح اس سے چھوٹی ہے اور اس کی محراب نوکدار ہے۔ اس کے کتبہ کے الفاظ میں بھی فرق ہے۔ چنانچہ پہلا حصہ سُریانی زبان میں ہے اور گلتی ۶:۱۴ کا اقتباس ہے۔ دوسرا حصہ پہلوی زبان میں ہے۔ یہ دوسری لوح غالباً دسویں صدی کی ہے۔

اگر ہم برنل کا ترجمہ درست مان لیں تو اس لوح پر یہ لکھا ہے:۔

(سُریانی زبان)۔ مَیں کسی چیز پر فخر نہ کروں گا سوا اپنے خداوند یسوع مسیح کی صلیب کے۔

(پہلوی زبان) جو سچا مسیح ہے اور خدائے برتر اور روح القدس۔ لیکن ہم ان وجوہ کا ذکر کر چکے ہیں جن کی بنا پر ہم اس ترجمہ کو رد کرتے ہیں۔ اور ڈاکٹر ونکو رتھ کا ترجمہ صحیح مانتے ہیں جس کی رُو سے پہلوی زبان کا ترجمہ اس صلیب پر یوں ہے "میرے خداوند مسیح رحم فرما"۔

چھوٹی لوح کی ایک خصوصیت قابل ذکر ہے[ع]۔ اس لوح کے بالائی حصہ میں بھی ایک چھوٹی سی صلیب ہے جو شکل میں بعینہ اس کے زیرین حصہ کی بڑی صلیب کے مشابہ ہے۔ اس چھوٹی صلیب کے

ع صفحہ ۱۵۱ کے مقابل کی تصویر ملاحظہ ہو۔

دونوں بازوؤں کی جانب دو مور ہیں جو صلیب کے دونوں سروں کو اپنی چونچوں میں لئے ہوئے ہیں۔

یہ صلیب دسویں صدی کی ہے جب پر دمال راجاؤں اور پلوا راجاؤں کی سلطنتیں ختم ہو چکی تھیں اور ہندوستانی کلیسیا کی دنیوی شان و حشمت بمثل سابق نہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ایام میں مسیحی کلیسیا نے یہ ضرورت محسوس کی کہ مسیحی عقائد و خیالات کو ہندی لباس میں پیش کرے۔ پس اس نے مور کو جو جنوبی ہندوستان میں بکثرت پائے جاتے ہیں اپنا قومی اور مذہبی نشان بنا لیا کیونکہ مقدس توما شہید کا مزار مبارک مائلاپور میں تھا جس کے لفظی معنی "مور کا گاؤں" ہے۔

ہم کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ صلیبیں اور لوحیں کہاں بنیں، کس نے بنائیں یا کس نے بنوائیں۔ بہرحال ان الواح سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے بنانے اور بنوانے والوں کا تعلق ایران کی نسطوری کلیسیا سے تھا۔

کشمیر کی نسطوری صلیبیں

ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ لنکا میں نسطوری صلیبیں دستیاب ہوئی ہیں۔ حال ہی میں شمالی ہندوستان سے بھی اس قسم کی صلیبیں ملی ہیں۔ یہ صلیبیں کشمیر کی قدیم قبروں میں بیاہر کی وادی سے دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کی بناوٹ، ان کے نقش و نگار اور الواح کی عبارت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صلیبیں نسطوری ہیں اور قبریں نسطوری مسیحیوں کی ہیں۔ یہ امور ثابت کرتے ہیں کہ قدیم صدیوں میں کشمیر میں بھی مسیحی کلیسیائیں جا بجا قائم تھیں اور وہاں نسطوری مسیحی بکثرت آباد تھے۔

فصلِ سوم

شاہی فرمان۔ پروانے اور دستاویزیں

گذشتہ فصلوں سے ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ساحلِ مالا بار پر مسیحیت دن بدن ترقی کرتی گئی یہاں تک کہ اس ساحل کے راجاؤں کو بھی مسیحیوں کے اقتدار کا لوہا ماننا پڑا اور انھوں نے مختلف زمانوں میں مختلف اوقات پر آٹھویں صدی سے دسویں صدی کے درمیان شاہی فرمانوں کے ذریعہ کلیسیا کو حقوق عطا کئے جو تانبہ کی تختیوں پر کندہ ہیں۔

شاہی فرمان

پہلا شاہی فرمان ایک تانبہ کی تختی پر کندہ ہے جو پونے پندرہ انچ لمبی اور چار انچ چوڑی ہے۔ اس تختی کے دونوں طرف فرمان کی عبارت قدیم ٹامل حروف اور گرنتھا حروف میں لکھی ہے۔ یہ دستاویز مہاراجہ ویرا راگھو چکراورتی نے کرنگانور کے تاجر ایردی کورتن کو عطا کی تھی جو مسیحی کلیسیا کا سربرآوردہ رکن اور فرمانِ شاہی کے مطابق "آقائے شہر" کرنگانور تھا۔ اس پروانہ کی رُو سے راجہ نے مانی گرامم کا شہر اس کو دیا۔ اور اس کو یہ خطاب بخشا "شاہِ چیرا کا ملک التجار جو دنیا بھر میں اعلیٰ ہے"۔ یہ خطاب کوئی خالی خطاب نہ تھا کیونکہ اس کی رُو سے تیلیوں کی ذات اور دستکاروں کی پانچ جماعتیں یعنی ترکھان، لوہار وغیرہ اس کے ماتحت کی گئیں۔ علاوہ ازیں وہ دریائے کرنگانور کے جہازوں کی آمد و رفت کی

اشیا کے محصول کا مالک بنایا گیا۔ اس فرمان کے چند فقرے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:۔

"ہری شری گنپتی کی جَے...... ہم نے مالی گرام کی حکومت کرنگانور کے اروی کورتن کو عطا فرمائی ہے۔ اس کا خطاب اب سے "مالابار کا شاہِ تجار" ہوگا۔ ہم نے اس کو یہ اختیار بھی عطا کیا ہے کہ وہ خنجر رکھے۔ تجارت پر حکومت کرے۔ اپنے واسطے ہراول اور پیش رَو رکھے۔ تُرہی کا استعمال کرے، چلنے کے لئے اپنے آگے کپڑے بچھوائے۔ پالکی کا استعمال کرے۔ ہم نے شاہی چتر اور نقارہ کا حق بھی اس کو عطا فرمایا ہے۔ وہ نشستگاہوں والے دروازے اور منقوش محرابوں کو تعمیر کروانے کا بھی حق رکھتا ہے۔"

اس شاہی منشور کی تاریخ سنہ ۷۷۴ء ہے۔

شنکر آچاریہ کا زمانہ

اس فرمانِ شاہی کی رُو سے کلیسیا کا دنیوی اقتدار بیش از بیش ہو گیا۔ لیکن اس دنیاوی طاقت نے اس کی روحانی حالت پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ دنیوی اقتدار کے نشہ میں وہ رفتہ رفتہ روحانی ترقی کی جانب سے غافل اور لاپروا ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ مسیحی نجات کی تبلیغ کے فرض کو اس نے یاد نہ رکھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی روحانی زندگی کمزور ہوتی گئی۔ اس شاہی منشور کے ملنے کے پچاس سال کے اندر اس کی روحانی حالت ایسی ابتر ہو گئی کہ جب نوویں صدی میں ہندو مذہب کا مشہور مصلح اور فلاسفر شنکر آچاریہ (جس کا ذکر باب نہم

کی فصلِ سوم میں کیا جائے گا) مالابار میں تھا، تو اس کے فلسفہ کی وجہ سے مسیحی کلیسیا میں ارتداد کی رَو بہہ نکلی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روائت کے مطابق اونچی ذات کے صرف تین صد خاندان مسیحیت پر قائم رہے۔ گو یہ روائت مبالغہ سے بھری نظر آتی ہے تاہم اس میں کچھ شک نہیں کہ کلیسیا کے روحانی تنزل کی وجہ سے کلیسیا کے بے شمار افراد اس خوفناک ارتداد کی لہر سے متاثر ہو گئے۔

مار فیروز۔ مار شاپور اور دیگر مسیحیوں کی آمد

اس آڑے وقت میں خدا نے مالابار کی کلیسیا پر رحم کیا۔ اور الٰہی انتظام نے ایک بار پھر نویں صدی کی پہلی چوتھائی میں مسیحیوں کی ایک بڑی تعداد کو مالابار بھیجا جو بشپ مار فیروز اور بشپ مار شاپور کی زیر سرکردگی کوئلن میں آئی۔ ان دو بشپوں کے ساتھ مروان شاپور یسوع بھی آیا جو ایک بڑا زبردست تاجر اور غالباً بشپ مار شاپور کا بھائی تھا۔

ان مسیحیوں کی آمد کے کیا اسباب تھے؟ گمان اغلب یہ ہے کہ جس طرح شاپور دوم کی ایذا رسانی کے زمانہ میں ۳۴۵ء میں توما تاجر اور دیگر مسیحی ہجرت اختیار کر کے مالابار آ گئے تھے اُسی طرح ۷۷۴ء اور ۸۲۳ء میں ایران کے اسلامی حکمرانوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر ایرانی مسیحی ہجرت کر کے مالابار آ گئے۔

یہ ایرانی مسیحی ۸۲۳ء میں کوئلون پہنچے۔ ان کی آمد سے کلیسیا کی ڈھارس بندھ گئی اور ان میں از سر نو جان پڑ گئی۔ ایک بیان کے مطابق جب

مار شاپور اور مار فیروز بالاباد آئے تو انھوں نے دیکھا کہ کوئلون اور اس کے مضافات میں قریباً پچیس ہزار مسیحی آباد ہیں۔ یہ بیان ثابت کرتا ہے کہ مذکورہ بالا روائت جس کے مطابق صرف تین سو خاندان مسیحیت پر قایم رہے تھے مبالغہ سے پُر ہے۔

ایرانی مہاجرین نے راجہ سے متعدد حقوق حاصل کرئیے۔ بالخصوص ان کو یہ حق عطا کیا گیا کہ وہ مسیحیت کی اشاعت کریں، اور غیر مسیحیوں کو بپتسمہ دے کر کلیسیا میں شامل کر لیں۔ وہ جس جگہ چاہیں گرجے تعمیر کریں اور اس غرض کے لئے راجہ نے خود ان کو اراضی عطا کی۔ چنانچہ مروان شاپور یسوع نے کوئلن شہر کی بنیاد ڈالی اور یہ سال کوئلن کا پہلا سال ہوا۔ اس نے یہاں ایک نہایت عالی شان گرجا بھی تعمیر کیا۔

۸۲۴ء کے شاہی منشور کے مطابق بعض حقوق ذیل میں درج ہیں۔

(۱) اگر مسیحیوں میں سے کوئی شخص کسی جرم کا ارتکاب کرے تو سرکاری افسران کو اس جرم کی تفتیش کرنے کا اختیار نہ ہوگا بلکہ کلیسیا کے ارکان ہی تفتیش کریں گے۔ (۲) اگر مسیحیوں کا کوئی ہندو خادم کسی جرم کا مرتکب ہوگا تو کلیسیا کے ارکان اس کی تفتیش کریں گے۔ (۳) مسیحیوں کے دینی اور دنیوی امور کا انتظام بشپ کے ماتحت ہوگا اور تمام امور میں آخری اپیل اُسی کے پاس ہو سکے گی۔ بشپ اپنی ایک پنچائت کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ اور اس فیصلہ کی کوئی اپیل نہیں ہوگی۔ (۴) راجہ کے لئے درآمد کا محصول اور گاڑیوں کا محصول اکٹھا کرنے کے مسیحی حقدار ہوں گے۔

یہ شاہی منشور تانبہ کی تختیوں پر کندہ ہے۔

ایک اور دستاویز ہے جو تانبہ کی چار تختیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ان سات

تانبہ کی تختیوں میں سے اب صرف پانچ تختیاں رہ گئی ہیں جن میں سے تین تختیاں کوٹیم کے پرانے مدرسۂ دینیات (Old Seminary) میں محفوظ ہیں اور دو تختیاں تِرُووَلّا کی مارتوما کلیسا کے میٹروپولیٹن کے پاس موجود ہیں۔ ان تختیوں کے سرے پر دونوں طرف سوراخ ہیں اور دستور کے مطابق وہ ایک چھلے سے پروئی ہوئی ہیں۔ یہ تختیاں قاناڈی توما تاجر کے پروانے کی تختیوں سے قدرے چھوٹی ہیں اور تقریباً دو بالشت لمبی اور چار انگلیاں چوڑی ہیں۔ ان تختیوں میں ایک قانونی دستاویز ہے جو راجہ کے ناظر کی منظوری سے لکھی گئی ہے۔ اس کی رُو سے مروان شاپور ایسو ع نے ترسا پلی کی کلیسا اور گرجا گھر کے حق میں اس اراضی کا انتقال کیا ہے جو کوئلن کے قرب وجوار میں واقع ہے اور جو اس کو راجہ کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ اس اراضی کے ساتھ ہی وہ چند غیر مسیحی خاندانوں پر حکومت کرنے کے حق کا بھی انتقال کرتا ہے۔ اس نے انجووَنم اور مانی گرامم کے حکمرانوں کو اس وقف جاگیر کا محافظ مقرر کیا۔ "جب تک زمین اور چاند اور سورج قائم ہیں"۔

ع لفظ "پلی" کے معنی گرجا ہیں۔ ان تختیوں پر مسیحیوں کو "ترسا گرجا والے" یا "ترسا پلی" کہا گیا ہے۔ لفظ "ترسا" (مسیح) ملیالم کے گیتوں میں مسیحیوں کے لئے عموماً استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ میں "ترسا یکل" کی بجائے مسیحیوں کو "کرسچن" کہا جاتا ہے)
تاتار کے مسیحیوں کو بھی "ترسا" کہا جاتا ہے۔ حضرت سعدی کا شعر مشہور ہے

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب ۞ گبر و ترسا وظیفہ خور داری

(برکت اللہ)

راجہ آئین کا پروانہ

سنہ ۸۲۲ء کے شاہی مشورے سے قریباً چھبیس سال بعد بادشاہ ستانو روی کے پانچویں سال یعنی سنہ ۸۴۸ء کے قریب راجہ آئین شاہ دیناڈ یعنی موجودہ ٹراونکور کے جنوبی حصہ کے راجہ نے کوئلن کے ترسا (یعنی آرتھوڈکس مسیحی کلیسیا کو جو شاپور یسوع نے قائم کی تھی) یہ حقوق عطا کئے :۔

(۱) ارادا ذات کی چار عورتوں۔ ان کے آٹھ بچوں اور دھوبیوں کے ایک خاندان کو کلیسیا کے مسیحیوں کی خدمت گزاری کے لئے دیا گیا۔

(۲) ان خدمت گاروں کو چند ایک مقامی محصولوں اور ٹیکسوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

(۳) ان خدمت گاروں کو یہ اجازت ملی کہ باوجود اچھوت ہونے کے کوئلن کے قلعہ میں اور مسیحی آبادی کے گلی کوچوں میں آ جا سکیں۔

(۴) ان کے مقدمات کی سماعت کا اختیار کوئلن کی مسیحی کلیسیا کے سپرد کیا گیا۔

(۵) اس پروانہ کی رو سے کلیسیا کو وزن کے بٹوں۔ ماپنے کے گزوں اور ٹھپّوں یعنی اسٹامپ (Stamps.) کا بھی نگران بنا دیا گیا۔ اب تک صرف راجہ ہی ان امور کے نگران ہوا کرتے تھے۔

یہ تمام حقوق شاپور یسوع کی درخواست پر بمقام کوئلن عطا کئے گئے۔

حقوق بالا کے عطا کئے جانے کے چند ماہ بعد سنہ ۸۴۹ء کے قریب راجہ آئین نے کوئلن کی کلیسیا کو اور کوئلن کے ان مسیحیوں کو جو سنہ ۸۲۵ء سے پہلے (یعنی شاپور یسوع کے دوبارہ شہر کو بسانے سے پہلے) کوئلن میں آباد تھے چند حقوق عطا کئے :۔

(الف) جو حقوق کوٹلن کی کلیسیا کو ملے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک بڑھئی کا خاندان اور ویلالا ذات (کاشتکار شودر) کے چار خاندان اور دو دیگر ذاتوں کے خاندان کلیسیا کی خدمت کے لئے ملے۔ (۲) ایک بڑے وسیع رقبہ کی اراضی کلیسیا کو عطا ہوئی۔ (۳) جو لوگ اس وسیع رقبہ کے اندر سکونت کریں کلیسیا کو ان کے مقدمات کی سماعت کا اختیار دیا گیا۔ (۴) راجہ نے حکم دیا کہ وینا ڈ کا ششم صدی لشکر کلیسیا کی جان و مال اور اراضی کا محافظ ہو۔ (۵) گزوں سے ماپنے اور بٹوں سے وزن کرنے کی فیس کا حاصل ملنے کا حق بھی دیا گیا۔

(ب) کوٹلن کے ان مسیحیوں کو جو شہر کے دوبارہ بسنے سے پہلے وہاں آباد تھے ذیل کے حقوق ملے۔

(۱) بعض ٹیکس معاف کئے گئے اور چند ایک ٹیکسوں کے جمع کرنے کا ان کو حق عطا ہوا۔ (۲) اشیائے درآمد پر محصول کے تعین کرنے کا حق دیا گیا۔ (۳) سرکاری افسروں کے ساتھ مل کر اشیا کے نرخ مقرر کرنے کا حق ملا۔ (۴) روزانہ محصولِ درآمد کی حفاظت کا حق ملا۔ ان کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ اگر ان کے جائز مطالبات اور شکایات پر توجہ نہ دی جائے تو وہ روزانہ محصول کو اور گزوں کے ماپنے اور بٹوں سے تولنے کی فیس کو دبالیں۔ (۵) ان مسیحیوں کو اپنے مقدمات کی خود سماعت کرنے کا حق عطا ہوا۔ (۶) کوٹلن کی اراضی پر خواہ مالک ہو کر خواہ کرایہ دار ہو کر دائمی یا عارضی قبضہ کریں۔ ان حقوق کے علاوہ بہتر ۷۲ دیگر حقوق عطا کئے گئے۔ ان حقوق کے پانے سے مسیحی کلیسیا کو زبردست اقتدار حاصل ہو گیا۔

بشپوں کی وفات

بشپ مار فیروز اور بشپ مار شاپور نہایت پارسا اور دیندار بشپ تھے جن کی روحانی زندگی سے کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کلیسیا کی روحانی نشوونما اور بہبودی کی خاطر وقف کر رکھی تھی۔ انھوں نے از حد کوشش کی کہ جس طرح کلیسیا نے دنیوی طور پر قوت حاصل کر لی تھی، وہ روحانی طور پر بھی طاقت حاصل کر کے مسیح کا زندہ بدن بن جائے۔ ان کی مساعیٔ جمیلہ کسی حد تک بار ور بھی ہوئیں۔ یہ بشپ ہندوستان میں ہی فوت ہو گئے اور کوئلن کے گرجا میں دفن کئے گئے ان کی وفات کے بعد دونوں کو مقدسین کا درجہ دیا گیا۔ اور وہ سریانی کلیسیا کے مقدسوں میں شمار ہونے لگے۔ مالابار کے تمام بشپوں میں غالباً یہی دو بشپ ہیں جن کو کلیسیا نے یہ رتبہ دیا ہے۔ مالابار کے متعدد گرجاؤں کے نام ان دونوں مقدسوں کے نام پر رکھے گئے مثلاً کیٹن اور پراوُور اور اُدیم پےرُور اور کوئلن کے گرجے ان دونوں مقدسوں (سریانی زبان میں مقدس = قادس) کے ناموں پر رکھے گئے۔ مثلاً کوئلن کا قادسیہ گرجا۔ کائن کلم کا قادسیہ گرجا (جو اب جیکوبائٹ ہے اور جو ۱۸۲۹ء میں بنا تھا) اُدیم پیرُور کا گرجا جو اب رومی کلیسیا کے قبضہ میں ہے اور سب مقدسوں کا گرجا (All Saints Church.) کہلاتا ہے جو کسی زمانہ میں مسیحی شاہی خاندان (جس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا) کا گرجا تھا وہ بھی قادسیہ گرجا تھا۔ اسی طرح پیرُور کا گرجا (جس کی بنیاد جیسا ہم حصہ اول میں ذکر کر چکے ہیں، مقدس توما رسول کے ہاتھوں سے رکھی تھی) جو اب رومی کلیسیا کے قبضہ میں ہے اور مقدس توما کا گرجا (St Thomas Church.)

کہلاتا ہے وہ بھی مار سبور کا گرجا تھا۔ یہ سبور کے سب گرجا گھر ان دونوں مقدس لشیوں کے نام سے موسوم تھے۔

راجہ سمہا کا کتبہ

کوچین کی ریاست کے قصبہ تلے کاڈ (Talekadd.) میں سریانی کلیسیا کے گرجا کے باہر جو صلیب زیر آسمان نصب ہے اس کے نچلے پتھر پر مالا بار کے بادشاہ راجہ سمہا (Rajasimha.) کے وقت کا ایک کتبہ ہے جو غالباً آٹھویں یا نویں یا دسویں صدی کا ہے۔ اس پتھر کے کتبہ پر بھی چند حقوق کا ذکر ہے جو راجہ نے مسیحی تاجروں کو عطا کئے۔

دسویں صدی کے قریب جب پرومالوں کا راج ختم ہوگیا اور ان کا ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا تو ان ریاستوں کے فرمانرواؤں نے بھی مسیحیوں کے تمام قدیم و جدید حقوق بدستور سابق برقرار رکھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مالا بار کی سریانی کلیسیا کی جماعتیں ہمیشہ اپنے اپنے راجاؤں کی مطیع اور فرماں بردار رعایا رہیں۔ ان کے حکمران بھی ان کی وفاداری پر فخر کرتے رہے۔ چنانچہ ۱۸۸۸ء میں کوٹیم میں مہاراجہ وسالکم تھیرونال نے بشپ مار جوزف ڈایونی سئیس کے ایڈریس کے جواب میں کہا۔

"آپ کی جماعت قدیم اور تاریخی روایات کا مجسمہ ہے۔ وہ ہمیشہ صلح پسندی۔ قناعت اور وفاداری کا نمونہ بنی رہی ہے۔ اگر پرسورام دوبارہ اس ملک میں جنم لے کر آجائے تو اس کو بھی سریانی کلیسیا کے مسیحیوں سے زیادہ وفادار اور پر امن لوگ کہیں نظر نہیں آئیں گے۔"

موجودہ زمانہ میں سریانی کلیسا کے مسیحیوں کو جو درجہ ٹراونکور اور کوچین کی ریاستوں میں حاصل ہے وہ انہی قدیم منشوروں کی طفیل ہے ۔

مسیحیوں کو حقوق ملنے کی وجوہات

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے ۔ کہ شاہانِ وقت نے مسیحیوں کو مختلف زمانوں میں یہ حقوق کیوں عطا کئے اور ان حقوق کے ذریعہ ان کی سماجی اور اقتصادی شوکت اور ان کے سیاسی اقتدار کی حشمت کو کیوں بڑھایا ؟

(۱) اس سوال کا پہلا جواب یہ ہے کہ سیاسی ضروریات زمانہ نے مسیحیوں کو یہ حقوق دلوائے ورنہ مالابار کے راجے نہ تو مسیحیت کے شیدائی تھے اور نہ کلیسیا کے دلدادہ تھے ۔ جن اوقات میں مسیحیوں کو یہ منشور اور پروانے ملے ان زمانوں میں مالا بار کے پرول راجے بیرونی دشمنوں سے خائف و ہراسان رہتے تھے اور ہر ممکن طور پر اپنی قوت کو مضبوط کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کا راج برقرار اور ان کا تخت قائم و پائدار رہے ۔ چونکہ مالا بار کے سریانی مسیحی (خصوصاً جو ایران سے آئے تھے) صاحبِ دولت و ثروت تھے اور ان کا شمار امیروں کبیروں میں ہوتا تھا لہذا راجاؤں نے ان کو سیاسی حقوق عطا کر کے ان کی دلجوئی کی تاکہ ان کی دولت اور مال و زر سے اپنی فوجوں کو مضبوط کر سکیں ۔ اور ان کے روپیہ سے سامانِ حرب کو مہیا کر سکیں ۔ اور دیگر ملکی اور جنگی ضروریات کو پورا کر سکیں ۔

پہلے شاہی پروانہ کی تاریخ ۳۴۵ء ہے ۔ یہ راشٹراکوٹا کے حملے کا زمانہ تھا جب کنجورم کے طاقتور شاہی خاندان چولا کو مطیع کر لیا گیا تھا ۔

اس زمانہ میں راغتر اگوٹا خاندان کے راجہ دھرواۓ پلّوا کے لشکر کو سمندر اور اپنی فوج کے درمیان گھیر لیا تھا اور اس کو شکست فاش دے کر جنگی ہاتھیوں کو چھین لیا تھا۔ جب مفتوح راجہ نے "اس کے حضور اپنا سر جھکایا" تب فاتح نے اس کے لشکر کی جان بخشی کی۔

دوسرے شاہی فرمان کے دنوں میں بھی مالابار پر بیرونی دشمنوں کے حملے شروع ہوئے جو شمال اور مشرق کی اطراف سے یکدم کئے گئے تھے۔ ایسے آڑے وقت میں سیم وزر کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ حملہ آوروں کے طمع کا منھ زر کے لقموں سے بند کیا جا سکے۔ قیاس یہی چاہتا ہے کہ دولت مند مسیحی تاجروں نے اس نازک وقت میں راجہ کی مدد کی ہوگی جس کے عوض مسیحی کلیسیا کو حقوق ملے۔

(۳) مسیحیوں کو حقوق ملنے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ کلیسیا کے افراد کی تعداد اور ان کی مالی حالت روز افزوں ترقی پر تھی۔ تجارت ان کا پیشہ تھا جس کی وجہ سے وہ صاحبِ ثروت ہو گئے تھے۔ جنوبی ہند کے سماجی نظام میں تجارت کرنے والوں کی کوئی ذات نہ تھی۔ جب ایران سے مسیحی آئے تو ان کی تجارت نے مالابار کی ریاست کو رونق دے کر چمکا دیا۔ مالابار کے مسیحی بھی تاجر پیشہ ہو گئے تھے اور تجارت کی وجہ سے ان کا رسوخ اور اقتدار روز افزوں تھا۔ وہ اپنے مال وزر سے نہ صرف خطرے کے وقت راجہ کی امداد کر سکتے تھے، بلکہ امن کے دنوں میں بھی ان کی طفیل ریاست کو فروغ حاصل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ملک تقویت پا گیا تھا۔

(۴) علاوہ ازیں کلیسیا کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور بیرونی ممالک کے مسیحیوں کی آمد سے اس تعداد میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ان

اسباب کی وجہ سے مسیحی کلیسیا کا اقتدار دن بدن بڑھتا گیا تھا۔ گو مسیحی کلیسیا ایک اقلیت تھی لیکن وہ ایک زبردست اور مقتدر اقلیت تھی جس کے شہر کا صاحبِ دولت وثروت تھے۔ کلیسیائی روایت کے مطابق مارشاپور نے مسیحیوں کی ایک بڑی بھاری جماعت کے ساتھ یہاں ہجرت اختیار کی تھی اور ان کی تعداد، دولت اور سیم وزر کا اثر قدرتی طور پر مالابار کے راجاؤں پہ ہوا اور انھوں نے کلیسیا کو وہ حقوق عطا کئے جن کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔

کلیسیائی زندگی پر حقوق کا اثر

ان اہم وجوہ کے باعث مسیحیوں کا رسوخ اور کلیسیا کا اقتدار روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ امورِ سلطنت میں بھی ان کو کافی دخل حاصل ہو گیا تھا۔ ریاست کے راجے ان کو منظرِ عنایت دیکھتے رہے اور ان کو مختلف اوقات پر حقوق دے کر ان کی عزت وحشمت بڑھاتے رہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مالابار کے علاقہ میں ہندو سماج کی ذات پات کی سخت قیود کے باوجود مسیحیوں کو ایک اعلیٰ ذات شمار کیا گیا۔ اور وہ رتبہ میں اونچی سے اونچی ذات سے کم نہ تھے۔ اس کا نتیجہ کلیسیا کے حق میں بہت بُرا ثابت ہوا۔ مسیحی کلیسیا خود ذات پات کے جال میں پھنس گئی اور بجائے خود ایک الگ ذات بن گئی۔ اس نے ذات کی قیود کی زنجیروں سے اپنے آپ کو ایسا جکڑ لیا کہ جہاں تک ان قیود کا تعلق تھا مسیحی کلیسیا اور ہندو جماعت میں کوئی فرق نہ رہا۔ چھوت چھات اور کھانے پینے وغیرہ کے معاملوں میں کلیسیا نے ہندو سماج کی ہر طرح تقلید کی۔ اور یوں کلیسیا نے ذات پات کی لعنت کا طوق خود اپنے گلے میں برضا ورغبتِ تمام آپ ڈال لیا۔ اس کا اثر کلیسیا کی تبلیغی کوششوں پر بہت بُرا پڑا۔ کلیسیا نے مسیحی نجات کا دروازہ

دوسروں پر بند کر دیا۔ کیونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ اگر دوسری ذاتوں کے لوگ مسیحی کلیسیا میں شامل ہو گئے تو اس کے اعلیٰ درجہ میں جس کو ہندوؤں نے بھی مان لیا تھا فرق آجائے گا۔ اور یہ خیال درست بھی تھا کیونکہ مسیحیت اصولِ اخوت و مساوات کی قائل ہے۔ لہٰذا اگر دیگر پنچ ذاتوں میں سے لوگ مسیحیت کے حلقہ بگوش ہو جاتے تو ان مسیحیوں کو ان سے محبت و مساوات کے اصول کے مطابق برادرانہ برتاؤ کرنا پڑتا جو ذات پات کے اصول کے منافی ہوتا پس کلیسیا نے اپنے تبلیغی فرائض کو پس پشت پھینک دیا اور دنیوی حشمت کے حصول کو مقدم سمجھ کر خداوند مسیح کے احکامِ تبلیغ سے غفلت اختیار کر لی۔ لیکن تبلیغ کلیسیا کی روح رواں ہے جس کے بغیر کلیسیا مردہ ہو جاتی ہے۔ پس لازماً سریانی کلیسیا کی روحانی حالت بد سے بدتر ہونے لگی اور بعد کی صدیوں کے دوران میں اس کلیسیا کے مسیحی انجیلِ جلیل کی تعلیم سے کورے ہوتے گئے اور کلیسیائی رسوم کی ادائیگی کو ہی مذہب کا جزوِ اعظم تصور کرتے رہے۔

ان صدیوں کے دوران میں گو کلیسیا کی مالی حالت اور دنیوی حشمت قائم رہی، تاہم اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ اُن کو غیروں کا محتاج نہیں ہونا چاہیئے۔ اس زمانہ میں بھی مسیحی اپنی روحانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے غیر ممالک کی جانب نظر اٹھاتے رہے۔ غیر ملکی پیٹریارک اور بشپ حسبِ دستور بشل سابق اُن پر حکمران رہے۔ انھوں نے کبھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ایک خود مختار کلیسیا بننے کا خیال نہ کیا۔ ان صدیوں کے دوران میں سریانی کلیسیا کے مذہبی قصص و روایات اور رسمیات نے کتابِ مقدس، انجیلِ جلیل اور مسیحی دینیات کی جگہ غصب کر لی۔ مسیحی کلیسیا رسومات کی ادائیگی کو

اپنی زندگی کا واحد مقصد خیال کر کے مسیحیت کی تعلیم اور عملی پہلو کی طرف سے غافل ہو گئی۔

باب ہفتم

جنوبی ہند میں اسلام کی آمد اور ولیار وٹم کی مسیحی سلطنت

جنوبی ہند کی قدیم سلطنتیں

قدیم زمانہ سے جنوبی ہند میں تین سلطنتیں قائم تھیں جن میں سے دو کورومنڈل کے ساحل پر اور ایک مالابار کے ساحل پر تھی۔ کورومنڈل کے ساحل پر شمال میں چولا خاندان حکمران تھا جس کا ذکر راجہ اشوک (از ۲۶۹ ق۔م۔ تا ۲۳۲ ق۔م) کے کتبوں میں آیا ہے۔ دوسری سلطنت پانڈیا خاندان کی تھی جو انتہائے جنوب میں حکمران تھے۔ یونانی سفیر میگس تھینز (—Megasthenes.) نے جو مسیح سے قریباً تین صدیاں پہلے راجہ چندر گپت (از ۳۲۱ ق۔م تا ۲۹۷ ق۔م) کے دربار میں آیا تھا اس خاندان کا ذکر کیا ہے۔ منجیٔ عالمین کی پیدائش سے تیس سال پہلے اس خاندان کے ایک راجہ نے رومی قیصر اگسطس کے دربار میں اپنا سفیر بھیجا تھا۔ جو ہندو سلطنت مالابار کے ساحل پر تھی وہ چیرا خاندان کی تھی۔ اس خاندان کے راجے گو آسے راس کماری تک

ساحلِ مالابار پر حکمران تھے۔

جنوبی ہند کی تجارت

ہم اپنی کتاب "مقدس قوبار سولِ ہند" میں ذکر کر چکے ہیں کہ بنی اسرائیل کے بادشاہ (بالخصوص سلیمان) ساحلِ مالابار کے لوگوں کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے۔ مالابار کی پیداوار خلیج فارس کی راہ سے سب سے پہلے عرب کے جنوبی ساحل پر پہنچتی تھی۔ یہاں سے اہل عرب کے کارروان یمن اور حجاز سے گزرتے ہوئے اشیا کو شام اور سکندریہ پہنچاتے تھے۔ ان مقامات سے یورپین ممالک کے تاجر خرید و فروخت کر کے ان اجناس کو اپنے ممالک میں پہنچاتے تھے۔ پس قدیم زمانے میں ہندوستان اور مغربی ممالک کی تجارت عرب کے ذریعہ ہوتی تھی۔ عرب میں مالابار کی تجارت کا مرکز ظفار تھا جو حضر موت کے ساحل پر واقع ہے اور یہاں کے تاجر سیدھے بلا واسطہ مالابار سے تجارت کیا کرتے تھے۔ یہ تجارت پہلی تین صدیوں میں خوب رونق پر رہی۔ اہلِ عرب مقامی تاجروں کے ساتھ جو بالعموم یہی ہوا کرتے تھے لین دین کیا کرتے تھے۔ اس غرض کے لئے انھوں نے ساحلِ مالابار کے مختلف مقامات پر دکانیں کھول رکھی تھیں۔

جب حضرت محمد نے زور پکڑا تو یمن اور حضر موت کے ساحلی باشندے بھی ۶۳۰ء میں اسلام کے مطیع ہو گئے۔ یہ سب تجارت پیشہ لوگ تھے اور اس زمانہ میں ان کی بحری تجارت عروج پر تھی۔ ان کے جہاز ایران، مصر، سندھ، مالابار لنکا۔ آیا جایا کرتے تھے اور یوں ان ممالک میں اسلام کی آواز پہنچ گئی۔

کہتے ہیں کہ دو سو سال بعد مالابار کا ایک راجہ مسلمان ہو کر عرب چلا گیا اور وہاں فوت ہو گیا۔ اس واقعہ کے دو سال بعد چند عرب خاندان کدنگلور میں

انہیں جہاں کے حاکم نے ان کو زمینیں اور باغات عطا کئے۔ انھوں نے مالا بار میں پہلی مسجد تعمیر کی۔ اور یوں جنوبی ہند میں اسلامی نوآبادیوں کی بنیاد پڑی۔ اور دینِ اسلام رواج پانے لگا۔ عرب اور عراق کے مسلمان تاجروں نے بھی یہاں بود و باش اختیار کر لی اور مالا بار کی اسلامی آبادی ترقی کرنے لگی۔ انھوں نے مالا بار کے اندرونی قصبوں کے ساتھ براہ راست تجارت کرنی شروع کر دی، جو اب تک صرف مسیحی تاجر ہی کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور مالا بار کے مسیحیوں میں باہمی کشمکش کے اسباب پیدا ہو گئے۔ جوں جوں مسلمانوں کی تجارت فروغ پاتی گئی یہ باہمی کشمکش بڑھتی گئی کیونکہ مسلمان تاجروں کی یہی کوشش تھی کہ مسیحیوں کی تجارت پر جو وہ اندرونی قصبات سے کرتے تھے، خود قابض ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحیوں کی اقتصادی حالت پر بہت بڑا اثر پڑا۔

مالا بار میں مسلمانوں نے کثرت سے گاؤں آباد کئے اور ان میں مسجدیں بنوائیں جہاں جمعہ اور عیدین کی نمازیں بڑی شان و شوکت سے ادا ہوتی تھیں۔ ان گاؤں میں حکومت کی طرف سے قاضی اور مؤذن مقرر تھے اور ان میں شرعی احکام جاری تھے۔ جب اچھوت ذاتوں کے لوگ اسلام اختیار کر لیتے ان کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی۔ پس ذات پات کی قیود اور دیگر پابندیوں سے بچنے کی خاطر لوگ اسلام قبول کر لیتے۔ متعدد مسلمانوں نے ہندو عورتوں سے شادیاں کر لیں اور متعدد ہندو مسلمان عورتوں کے ساتھ بیاہ کرنے کی خاطر مسلمان ہو گئے۔ غرضیکہ مختلف وجوہ کے باعث جنوبی ہند میں اسلام ترقی پکڑتا گیا۔ ساحلِ مالا بار کا شہر کنانور عرب و ایران کی تجارت کا مرکز بن گیا۔ یہاں کا ایک وزیر جو قوم کا نائر تھا مسلمان ہو گیا اور اس کا خاندان تاریخ میں "خاندانِ علی راجا" کے

نام سے مشہور ہے۔ اس کی بحری قوت بڑی زبردست تھی اور اس کی تجارت عرب سے لے کر چین کے شہروں میں پھیلی ہوئی تھی انہیں کی وجہ سے اس کا اقتدار حاکموں سے بھی بڑھ کر تھا۔

اسلام کا عروج اور جنوبی ہند کی کلیسیا

جب اسلام کی تلوار نے مشرق کے متعدد ممالک کو فتح کر لیا تو وسط ایشیا اور مغربی ایشیا کے ممالک کی کلیسیاؤں کو اسلامی حکام کے ہاتھوں طرح طرح کی ایذائیں پہنچیں۔ ان سیاسی اور مذہبی وجوہ کے باعث ایران کی کلیسیا مدت تک اپنے تعلقات کو مالابار کی کلیسیا کے ساتھ بغیر خلل کے قائم نہ رکھ سکی۔ ایران کے سیاسی حالات کی وجہ سے کلیسیا کے نظام میں بھی فرق آنا شروع ہو گیا۔ انطاکیہ کے گریک پیٹریارک ایلیاس نے ۹۱۰ء میں بغداد میں آرتھوڈکس کیتھولی کوس کا صدر مقام از سر نو بحال کر دیا جو نسطوری بدعت کے وقت (۴۳۲ء) سے خالی تھا۔ نسطوری کلیسیا بھی اسلام کے متواتر حملوں کا شکار رہتی تھی۔ ان سیاسی حالات کی وجہ سے ہندوستان کی کلیسیاؤں کا نظام بھی درہم برہم ہو گیا چنانچہ ۱۲۹۳ء کے قریب وینس کا سیاح مارکوپولو ہم کو بتلاتا ہے کہ مالابار کا بشپ اب براہِ راست بغداد کے پیٹریارک کے ماتحت نہ تھا بلکہ سکوترہ کے آرچ بشپ کے ماتحت تھا جو خود بغداد کے پیٹریارک کے ماتحت تھا۔ آخر وہ زمانہ بھی آگیا جب اسلام کی تلوار نے ایران اور ہندوستان کے کلیسیائی

۵۔ ملیبار مصنفہ حکیم سید شمس اللہ قادری (مسلم یونیورسٹی پریس۔ علیگڈھ ۱۹۳۰ء)

تعلقات کا خاتمہ کر دیا۔

جب تیرھویں صدی میں مغربی اقوام کی کلیسائے روم نے اپنے نبی اور آقا خداوند مسیح کے احکام کی صریح خلاف ورزی کرکے مغربی ایشیا میں نام نہاد "صلیبی جنگ" شروع کی تو اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مشرق و مغرب کے مسیحیوں اور مسلمانوں میں دائمی تنازعہ اور مخاصمت کے بیج بوئے گئے حتیٰ کہ مسیحیت اور اسلام کے نام لیوا دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ جوں جوں ساحل مالابار[1] پر مسلمانوں کی طاقت بڑھتی گئی اور ایرانی کلیسیا کی روز افزوں کمزوری کی وجہ سے ہندوستانی کلیسیا کمزور ہوتی گئی توں توں مقامی راجے اور زموری[2] مسلمانوں کو بنظرِ عنایت دیکھتے گئے۔ بالآخر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنا الوسیدھا کرنے کی خاطر صرف مسلمانوں پر ہی انحصار کرنے لگ گئے۔ جب ابن بطوطہ نے ۱۳۴۲ء میں مالابار کی سیاحت کی تو اسلامی اقتدار کا یہ حال تھا کہ گوا سے کوئلن تک مسلمان آباد تھے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

"یہاں کی عورتیں خوبصورت اور باعفت ہوتی ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت ہے کہ سب کی سب حافظِ قرآن ہیں۔ شہر میں تیرہ مکتب لڑکیوں کے لئے اور تیئیس مکتب لڑکوں کے لئے قائم

---

[1] مالابار اور مالان کار ایک ہی بات ہے۔ اہل عرب "کار" (یعنی ساحل) کی بجائے "بار" استعمال کرتے تھے۔

[2] "زموری" غالباً لفظ "ساموندری" کی مسخ شدہ صورت ہے جس کے معنی "سمندر کا بادشاہ" ہے (ملیبار مصنفہ سید شمس الہدیٰ صفحہ ۹)

ہیں .... فاکنور میں بہت سے مسلمان ہیں ۔ ان میں سب سے بڑا حسین ہے جو قاضی اور خطیب بھی ہے ۔ اس نے ایک جامع مسجد بنوائی ہے ۔ راجہ کے پاس تیس جنگی جہاز ہیں ۔ لیکن ان سب کا افسر ایک مسلمان ہے .... منگلور میں چار ہزار مسلمان ہیں اور شافعی مذہب کا ایک قاضی بھی ہے .... ہیلی بڑا شہر ہے جس میں ایک جامع مسجد ہے اور جہازوں کے سوار ہونے والے اس جامع مسجد کی نذر ملتے ہیں ۔ اس مسجد میں طالب علموں کو سبق دیا جاتا ہے .... وہ فتن کی مسجد اور کنوئیں کو راجہ نے تعمیر کیا تھا جس نے اسلام قبول کر لیا تھا .. کولم میں مسلمان سوداگر کثرت سے رہتے ہیں ۔ ان میں سب سے بڑا شیعہ مذہب کا پیرو ہے ۔ اس شہر کا قاضی قزوین کا ایک فاضل ہے ۔ مسلمانوں کی اس شہر میں بہت عزت ہے اور راجہ بھی مسلمانوں کی نہایت تعظیم کرتا ہے ۔"

چودھویں صدی میں جنوبی ہند میں مسلمان اس قدر طاقتور ہو گئے تھے کہ انھوں نے رومی کلیسیا کے بشپ جورڈن کے عہد اسقفیت میں پانچ ڈومنکی اور دو فرانسسکی راہبوں کو عقوبت دے کر جام شہادت پلا دیا ۔

ولیار وٹم کی مسیحی سلطنت

جب مالابار کے ساحل کے مسیحیوں نے مسلمانوں کا روز افزوں غلبہ

؎ سفر نامۂ ابن بطوطہ (اردو) مترجمہ مولوی محمد حسین ایم ۔ اے ۔ مطبوعہ لاہور سنہ ۱۸۹۸ء جلد دوم از صفحہ ۲۷۶ تا ۳۰۲)

دیکھا تو وہ ان کے جور و تشدد کے ہاتھوں تنگ آ کر تارکِ وطن ہو گئے اور زمورن کی حدود سے ہجرت کر کے کوچین کے راجہ کی حدود میں اپنے بھائیوں کے درمیان آ بسے۔ ان کو اب یہ احساس ہوا کہ ان کی بقا اور زندگی کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور اپنی حفاظت کیلئے دوسروں کی طرف نہ دیکھیں۔ ان کی طاقت ابھی تک خاصی زبردست تھی پس انھوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو حکمران اور راجہ مقرر کر لیا تاکہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں سے محفوظ رہ سکیں۔ اس مسیحی راجہ کا نام "ویلیارڈم" تھا اور اس کی راجدھانی اُدیم پرور تھی۔ اس راجہ نے ایک مسیحی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے اور پوتے نسل در نسل حکمرانی کرتے رہے۔ اس خاندان کے راجاؤں کا خطاب "مقدس توما کے مسیحیوں کا راجہ" تھا۔

جنوبی ہند کے مسیحی آج بھی اس راجہ کا نام بڑے فخر سے لیتے ہیں۔ ہم کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس بادشاہت کی ابتدا کب ہوئی اور وہ کتنی مدت تک قائم رہی۔ جنوبی ہند کی مسیحی کلیسیا کی تاریخ کی طرح اس مسیحی سلطنت کی تاریخ بھی گمنامی کے پردے میں چھپی ہے۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ ۱۴۳۹ء میں رومی کلیسیا کے پوپ یوجین چہارم (Eugene IV.) نے اس سلطنت کے مسیحی راجہ کے پاس ایک سفیر بھیجا تھا اور ایک خط میں تحریر کیا تھا۔

"مسیح میں میرے عزیز ترین بیٹے توما ہندوستانیوں کے نامور مہاراجہ کے نام۔ دعائے صحت اور رسولی برکت کے بعد آپ کو معلوم ہو کہ ہم کو خبر ملی ہے کہ آپ اور آپ کی رعایا مسیحی ہیں..... وغیرہ"

حال ہی میں ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔
"ویلیارڈم کا راجہ توما چینا منگلم (Channa Manglam.)
میں رہائش رکھتا تھا۔ ۲ جنوری ۱۴۵۰ء
کے روز فوت ہو گیا۔"

قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسیحی سلطنت کا خاتمہ ۱۵۰۰ء کے قریب ہو گیا تھا۔

کہتے ہیں کہ جب اس خاندان کا آخری راجہ بغیر اولاد کے مر گیا تو مسیحیوں نے متفق الرائے ہو کر ایک ہندو کو اپنا راجہ مقرر کر لیا جو ادیم پرور کا راجہ بھی تھا۔ جب اس راجہ کا خاندان بھی ختم ہو گیا تو کوچین کا راجہ رشتہ کی نزدیکی کی وجہ سے اس کا وارث بنا اور وہ مسیحیوں پر حکمران ہو گیا۔ اس وقت سے اب تک مالابار کے تمام مسیحی کوچین اور ٹراونکور کے ہندو راجاؤں کی رعایا ہوتے چلے آئے ہیں۔

ویلیارڈم کی مسیحی سلطنت پرتگیزوں کی آمد سے پہلے ختم ہو چکی تھی لیکن ۱۵۰۱ء میں ادیم پرور میں مسیحی راجاؤں کا محل ابھی کھڑا تھا۔ کیونکہ اس سال ایک فرانسسکی مبلغ اس محل میں اقامت گزیں ہوا تھا۔ ۱۵۰۲ء میں جب واسکوڈے گاما دوسری مرتبہ کوچین آیا تو کرنگانور کے بعض مسیحیوں نے اس کو مسیحی سلطنت کے قدیم راجاؤں کا عصائے شاہی ہدیہ کے طور پر دے کر کہا۔

"ہم آپ کی آمد پر نہایت محظوظ ہوئے ہیں۔ قدیم زمانے میں ہمارے علاقہ میں ہماری جماعت کا اپنا راجہ ہوا کرتا تھا۔ ہم اس کا عصا اور راجہ پیرومل کا وہ فرمان آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جس کی رو سے اس

کو حکومت کرنے کا حق عطا کیا گیا تھا۔ ہماری جماعت کی تعداد تیس ہزار کے قریب ہے۔ اور ہم سب کی یہی خواہش ہے کہ اب سے شاہِ پرتگال ہم پر حکمرانی کرے۔"

اس عصا کا رنگ سُرخ تھا اور اس پہ چاندی کے دو چھلے تھے۔ ایک چھلے پر سے چاندی کی تین گھنٹیاں آویزاں تھیں۔

پچاس سال سے زائد عرصہ ہوا ہے کہ ٹراونکور کی جھیل ویمبہ ناڈ (—Vembanad.) کے مشرقی کنارے سے کسی راجہ کا ایک چھوٹا بت برآمد ہوا۔ اس بت کے گلے میں موتیوں کی مالا ہے جس کے درمیان میں ایک صلیب آویزاں ہے۔ یہ بت پیرومال پلّی وانور (—Pallivanavar.) کا ہے۔ جس کے لفظی معنی ہیں "جو راجہ جو گرجا میں رہائش رکھتا تھا" یہ بت پلّی ونوّر کی قبر سے برآمد ہوا ہے جو نیلم پُرور کے پلّیل (-Palliyil.) بھگوتی مندر کے باہر واقع تھی۔ عوام میں یہ بات مشہور تھی کہ اس قبر کی تہ زمین میں ایک بڑا خزانہ مدفون ہے۔ اس خزانہ کو حاصل کرنے کی خاطر جب رات کے وقت یہ قبر عجلت سے کھودی گئی تو مزدوروں کو پتھر کی ایک بڑی لوح دستیاب ہوئی جس پر ایک صلیب کندہ تھی۔ چونکہ وہ مزدور مسیحی تھے انھوں نے قبر کو کھودنے سے انکار کر دیا۔ اس بت کے دہنے ہاتھ میں ایک عصا بھی ہے جس کے اوپر کا حصہ کھدائی کے وقت جلدی کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ یہ بت کسی مسیحی راجہ کا ہے جس نے ہندومت کو ترک کر دیا تھا۔ (دیکھو ضمیمہ ب)

مالابار کے مسیحی بالخصوص سریانی کلیسیا کے دکھنی مسیحی اپنی تاریخ کے بعض واقعات کو گیت اور ڈراما بنا کر تہواروں عیدوں اور خوشی کے موقعوں

مثلاً شادی بیاہ کے وقت ان کا سوانگ بھرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ مقدس توما کی آمد۔ قانائی توما کی آمد وغیرہ کے گیت اور ویلیار وٹم کے شاہی خاندان کے متعلق گیت گاتے ہیں۔ ان اوقات پر وہ اچھلتے، کودتے، ناچتے اور پٹے بازی کرتے ہیں۔ ان گیتوں میں مالابار کے مسیحیوں کی تاریخ۔ روایات اور قصص ہندوستان کی سریانی کلیسیا کے مقدسوں کے حالات۔ متداول کہانیاں (Folk-lore.) ان کی قومی تمناؤں اور مرادوں کا پورا ہونا۔ ان کی آرزوؤں پر پانی پھرنا۔ ان کی امنگوں کا خون ہونا۔ ان کی بعض کلیسیاؤں کا حسرت ناک انجام۔ ان کی فتوحات اور ناکامیاں وغیرہ۔ غرضیکہ ان گیتوں میں سب باتیں موجود ہیں۔ سریانی مسیحیوں کے پشتینی گویّے اور بھاٹ بھی ان کی تاریخ کے واقعات مختلف تہواروں اور موقعوں پر ان کے گھروں کے دروازوں پر گاکر سناتے ہیں۔

مغربی تہذیب اور رسوم کی وجہ سے سریانی مسیحیوں کے یہ دستور بھی تیز رفتاری سے بدل رہے ہیں۔ مقامِ افسوس ہے کہ "شمالی سریانی" مسیحی ان پرانے دستوروں اور خوشی کے طریقوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگ گئے ہیں گو "دکھنی" مسیحیوں میں ابھی تک ان طریقوں کا رواج ہے۔ اگرچہ ان میں بھی یہ باتیں اب غریب طبقہ تک ہی محدود رہ گئی ہیں۔

باب ہشتم

ہندوستان کی کلیسیا کی کمزوری کے اسباب

دسویں صدی سے لے کر پرتگیزوں کی آمد یعنی پندرھویں صدی کے آخر تک تاریخ جنوبی ہند کی کلیسیا کے حالات پر روشنی نہیں ڈالتی۔ ان پانچ صدیوں کی دراز مدت تک کلیسیا کی زندگی کے تمام شعبے گمنامی کے پردوں میں چھپے ہیں۔ یہ زمانہ ہر معنی میں کلیسیائے ہند کا اور بالخصوص جنوبی ہند کی کلیسیا کا "تاریک زمانہ" ہے۔ پس اب وقت آگیا ہے کہ مؤرخ ان پہلی پندرہ صدیوں پر نظر کر کے کلیسیا کی حالت کا جائزہ لے۔

مسیحیت کی اشاعت کے ذرائع اور وسائل

ہندوستان میں مسیحیت کی اشاعت میں جغرافیائی حالات نے بڑی مدد کی تھی۔ اگرچہ ہمارا ملک مغربی ممالک کی کلیساؤں سے دور تھا لیکن وہ مشرق کی کلیساؤں کے مرکزوں کے بہت نزدیک تھا۔ ہم سطورِ بالا میں بتلا چکے ہیں کہ ہندوستان اور ان مرکزوں کے ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات مسیحیت کی ابتدا ہی سے قائم تھے۔ بحری راستے اور بری قافلے ہندوستان کو ایران۔ مسوپوتامیہ۔

سکندریہ وغیرہ سے ملاتے تھے۔ پس ان پندرہ صدیوں کے دوران میں مسیحی مبلغین اور مہاجرین ایران میسوپوتامیہ اور اُن ساحلی مقامات و ممالک سے آتے رہے جو خلیج فارس اور جنوبی عرب کے دونوں طرف واقع ہیں۔ مسیحی مہاجرین نے ہمارے ملک میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ غیر ملکی مسیحیوں کی آمد اور ان کی مستقل رہائش نے اور پردیسی مبلغین اور رشیوں کی تبلیغی مساعی نے ہندوستان کی کلیسیا کو مضبوط اور استوار کر دیا۔

برِ عظیم ہندوستان کے مسیحی مسیحیت کی اشاعت کرکے اپنے ملک میں اپنا روحانی اقتدار قائم رکھ سکتے تھے لیکن کلیسیا نے یہ نہ کیا۔ جہاں تک پہلی پندرہ صدیوں کے حالات کا پتہ چلتا ہے اس کلیسیا نے اپنے آقا اور منجی کے حکم پر عمل نہ کیا اور ایران کی نسطوری کلیسیا سے بھی تبلیغ کے فرض کو ادا کرنے کا سبق نہ سیکھا۔ بالخصوص جنوبی ہندوستان کی کلیسیا نے غیر مسیحیوں میں منجئ عالمین کی بادشاہت کو پھیلانے اور مشرکوں اور بت پرستوں کو نجات کی بشارت دینے کا کوئی موثر ذریعہ اختیار نہ کیا۔ اگر جنوبی ہند کی مسیحی کلیسیا جو شمار میں تقریباً نصف کروڑ ہے۔ اور ٹراونکور۔ کوچین اور مالا بار میں قریباً دو سو میل لمبے اور چالیس میل چوڑے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے، اپنے خداوند اور منجی کے فرمان کے مطابق جنوبی ہند کے کروڑوں ہندوؤں کو مسیحیت کا حلقہ بگوش کر دیتی تو ہندوستان کی کایا پلٹ گئی ہوتی۔ لیکن جہاں تک تاریخ کی روشنی اس پر پڑتی ہے ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ جنوبی ہند کی کلیسیا نے تبلیغ کی جانب دھیان نہ کیا۔

اس افسوسناک صورتِ حال کے کیا اسباب تھے؟ ذیل میں ہم صرف چند اسباب کا مختصراً ذکر کرتے ہیں:۔

ہندوستان کی کلیسیا کی غلامانہ ذہنیت

اول - ہندوستان کی کلیسیا کبھی آزاد اور خود مختار کلیسیا نہ بنی - ان پندرہ صدیوں کے دوران میں اس برِعظیم کی کلیساؤں کے میٹرو پالی ٹن اور بشپ ہمیشہ بیرونی ممالک سے ہی آتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسائے ہند اپنی روحانی ضروریات کے لئے ہمیشہ غیروں کی دست نگر رہی۔

(۱)

واجب تو یہ تھا کہ جب مقدس توما رسول خود برِعظیم ہندوستان کے شمال مغرب اور جنوب میں وارد ہوئے تھے اور آپ نے اِس برِعظیم کے دونوں حصوں میں کلیسائیں قائم کردی تھیں اور اپنے جانشین بشپوں کی تقدیس بھی کردی تھی تو ہمارے ملک ہی میں مشرق کی پیٹریارکیٹ قائم ہوجاتی اور ہندوستانی مسیحی خود پیٹریارک ہوتے اور جن ممالک میں مسیحیت کا پرچار نہیں ہوا تھا ان میں مبلغین بھیجکر ان کی کلیساؤں کے لئے میٹروپالیٹن اور بشپ مقرر کرتے۔ کلیسیائے ہند کو ابتدا ہی سے ایک آزاد۔ خود مختار زبردست کلیسیا اور اُس کے پیٹریارک کو برِعظیم ہندوستان کی کلیساؤں کا حکمران ہونا چاہیے تھا۔

جب ہم کلیسیائے جامع کی پہلی صدیوں کی تاریخ پر نظر کرتے ہیں' تو ہم پر یہ حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے کہ رسولی زمانہ میں اور رسولوں کے شاگردوں کے زمانہ میں بھی مختلف مقامات کے بشپ کسی اسقفِ اعظم کے ماتحت نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ہر بشپ صرف اپنے علاقہ کا واحد حکمران ہوتا

تھا۔ چنانچہ انطاکیہ کے بشپ اگنیشیس (-Ignatius) کے خطوط (سنہ ۱۱۰ء) اس امر کے گواہ ہیں کہ انطاکیہ کے قرب وجوار کے بشپ اس کے ماتحت نہیں تھے۔ اور اس ابتدائی زمانہ میں تمام بشپ ایک دوسرے کے ہم پلہ سمجھے جاتے تھے پس کسی غیر ملکی بشپ یا پیٹریارک کا یہ حق نہیں تھا کہ وہ اپنی جغرافیائی حدود کے باہر ایسی کلیساؤں پر حکمرانی کرتا جن کو خود مقدس توما رسول شہید نے قائم کیا تھا۔ چنانچہ قسطنطنیہ کی کونسل (سنہ ۳۸۱ء) کے قانونِ دوم میں لکھا ہے:۔

"کسی بشپ کا یہ کام نہیں کہ وہ اپنے علاقہ کے باہر اُن کلیساؤں سے کے پاس جائے جو اس کی حدود میں نہیں ہیں"

پس اس قاعدہ کلیّہ کا اطلاق کلیسائے ہند پر بھی ہونا چاہیئے تھا۔ واجب یہ تھا کہ جن بشپوں کی مقدس توما رسول نے تقدیس کی تھی ان کا سلسلہ باقاعدہ متواتر طور پر دورِ حاضرہ تک جاری رہتا اور ان میں سے ایک کلیسائے ہند کا پیٹریارک ہوتا جس کا درجہ روم۔ سکندریہ۔ انطاکیہ وغیرہ کی کلیساؤں کے پیٹریارکوں کے برابر سمجھا جاتا۔ لیکن نامعلوم حالات کی وجہ سے مقدس توما کے تقدیس کردہ بشپوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اور غیر ممالک کے بشپوں نے ہندوستان کی کلیساؤں پر اپنا تسلط جما لیا۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ جب مقدس توما شہید ہوگئے اور ان کے تقدیس کردہ بشپ رحلت کر گئے تو کلیسائے ہند ایک خود مختار اور آزاد پیٹریارکیٹ ہونے کی بجائے ایڈیسہ کی کلیسا اور بعد میں ایران کی کلیسا کے پروں کے نیچے سہل انگاری کی زندگی بسر کرنے لگ گئی۔ اس نے عیسو کی مانند اپنے پیدائشی حق کو ناچیز جانا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلامی کا طوق ہمیشہ کے لئے

انہی کے گلے میں پڑ گیا۔ وہ اپنی روحانی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر شروع ہی سے غیر ممالک کی کلیساؤں کی محتاج ہو گئی۔

(۲)

اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان غیر ممالک میں سیاسی انقلابات رُونما ہوئے تو ان کا فوری اثر ہندوستان کی کلیسا کے نظام پر اور اس کی روحانی زندگی کی نشوونما پر پڑا۔ مثلاً ابتدا ہی سے رومی اور ایرانی سلطنتوں میں باہمی مخاصمت تھی جو خداوند مسیح کی پیدائش سے بھی پہلے سے چلی آ رہی تھی۔ اس دشمنی کی وجہ سے دونوں سلطنتوں کے درمیان پانچویں صدی مسیحی کے بعد تک بھی جنگیں جاری رہیں جن کے باعث ممالکِ یورپ مغربی ایشیا اور دریائے فرات کے مشرق کی جانب کے ممالک میں آمدورفت کا سلسلہ سالہا سال تک منقطع ہو جاتا تھا۔ اس کا اثر ایران اور شام کی کلیساؤں پر پڑتا تھا۔ چونکہ یہ کلیسائیں کلیسائے ہند پر حکمران تھیں لہذا ان سیاسی حالات کا اثر ہندوستانی کلیسا کی زندگی اور بقا پر پڑتا تھا۔ جب آمدورفت کا سلسلہ بحال ہو جاتا تھا پردیسی بشپوں اور مبلغوں کا آنا جانا ہو سکتا تھا لیکن ان پانچ صدیوں کے دوران میں ان راستوں کا کھلا رہنا کبھی یقینی امر نہیں ہوتا تھا کیونکہ ان میں اکثر اوقات لمبے وقفے اور ناغے ہوا کرتے تھے اور ان ناغوں کا اثر مدتِ مدید تک ہندوستانی کلیسا کی روحانی زندگی اور نشوونما پر پڑتا تھا۔

ہم اس حقیقت کو ایک اور مثال سے واضح کر دیتے ہیں۔ عرب کی فتوحات اور اسلامی سلطنت کے عروج نے ۶۳۳ء کے بعد ہندوستان اور بیرونی ممالک کے باہمی تعلقات کو جو پہلے ہی نہایت محدود قسم کے تھے تقریباً

منقطع کر دیا لیکن جب اسلام کی تلوار نے ممالک شام و ایران وغیرہ کو مفتوح کر لیا اور ان ممالک کی کلیسیائیں تلوار کا لقمہ ہو گئیں یا جان بلب ہو گئیں تو وہاں کے پیٹریارکوں کے لئے ناممکن ہو گیا کہ ہندوستان کو اپنے میٹروپالیٹن اور بشپ حسبِ سابق بھیج سکیں۔ جب سالہا سال تک یہ انتظام پورا نہ ہو سکا اور ان ممالک کے میٹروپالیٹن اور بشپ نہ آ سکے تو قدرتی طور پر ہندوستان کی کلیسیا کی ہستی معرضِ خطر میں پڑ گئی اور کمزور ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ہندوستانی خادمانِ دین کا تقرر تک ان غیر ملکی بشپوں کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا پس جب اچانک موت۔ سیاسی حالات اور انقلابات یا نیرنگئ زمانہ کی کسی اور وجہ سے غیر ملکی بشپوں کا ہندوستان میں داخلہ عارضی طور پر بھی بند ہو جاتا تو کلیسیائے ہند کا سارا انتظام درہم برہم ہو جاتا تھا اور کلیسیائیں سالہا سال تک روحانی قیادت کے بغیر سسکتی رہتی تھیں۔

اگر ان پندرہ صدیوں کے دوران میں ہمارے ملک میں پیٹریارکیٹ قایم ہوتی اور یہاں کے پیٹریارک اپنی کلیسیا کا انتظام خود چلاتے اور ہندوستانی میٹروپالیٹن۔ صدر اسقف۔ بشپ وغیرہ کی تقدیس کرتے اور کلیسیاؤں کی تنظیم اس برِ عظیم کے طول و عرض میں مکمل طور پر ہو جاتی تو صورتِ حالات بالکل دگرگوں ہوتی۔ کلیسیائے ہند کمزور اور ناتوان ہونے کی بجائے مضبوط اور زبردست ہوتی۔ ہندوستان کے کروڑوں باشندے اس وقت مسیحیت کے حلقہ بگوش ہو جاتے لیکن کلیسیائے ہند نے مقدس توما کی شہادت کے بعد پیٹریارکیٹ قائم کرنے کی بجائے صرف اس بات پر اکتفا کیا کہ مقدس توما رسول کے تقدیس کردہ بشپوں کے خاندان پکلومٹم (Pallomattam) کے لوگ پشت در پشت فقط آرچ ڈیکن بنے رہیں۔ اور کلیسیا کا مالی اور دینوی

انتظام ان کے ہاتھوں میں رہے جس میں غیر ملکی بشپ دخل انداز نہ ہوں۔ لیکن آرچڈیکنوں کے سپرد صرف کلیسیا کے دنیوی اموری ہوتے ہیں اور کلیسیائی نظام کا اصل مرکز بشپ ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ گردش زمانہ کی مختلف تبدیلیوں کی وجہ سے اور اسلام کے عروج اور دیگر سیاسی انقلابات اور آسمانی آفات کے سبب سے جب مرکز ہی نہ رہا ہو تو کلیسیا کی ہستی کا خدا ہی حافظ ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے باب چہارم کی فصل اول میں ہم بتلا چکے ہیں کہ ساتویں اور آٹھویں صدی میں رودشیر کے میٹروپالیٹن نے بالفاظ پیٹریارک یسوع یحب "کلیسیائی قوانین کے خلاف گردن کشی کر کے بشپوں کی تقدیس کا دروازہ ہندوستانیوں پر بند کر دیا تھا۔" موجودہ زمانہ میں بھی جنوبی ہند میں ترچور کی کلدی یا نسطوری کلیسیا اس افسوسناک حالت کی ایک زندہ مثال ہے۔ جیسا ہم باب سوم میں بتلا چکے ہیں عراق کے سیاسی انقلابات کی وجہ سے اس کلیسیائے مشرق کا پیٹریارک جلاوطن ہو کر امریکہ کے شہر شکاگو میں پناہ گزیں ہے اور اس کا آخری غیر ملکی میٹروپالیٹن ۱۹۴۵ء میں کسی ہندوستانی کی تقدیس کئے بغیر فوت ہو گیا۔ اور تادم تحریر اس میں کوئی بشپ موجود نہیں کہ خادمانِ دین کا تقرر بھی ہو سکے۔

(۳)

راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ اگر ہندوستان کا اپنا پیٹریارک ہوتا جو ایک زندہ اور زبردست کلیسیا کا سر ہوتا تو عین ممکن ہے کہ جو پھوٹ مشرقی اور مغربی کلیساؤں میں صدیوں سے چلی آتی ہے وہ کبھی نہ پڑتی اور آج مسیحی کلیسیا تمام دنیا میں حقیقی معنوں میں "کلیسیائے جامع" ہوتی۔ جب ہم اس پھوٹ اور جدائی پر غور کرتے ہیں جو مشرقی اور مغربی کلیساؤں میں صدیوں سے چلی آئی ہے تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ ان دونوں میں باہمی تنازعہ کیوں ہوا اور اگر پھوٹ پڑ بھی گئی تھی تو یہ خلیج کیوں روز بروز

بڑھتی گئی۔ دونوں کلیسائیں رسوم و عقاید اور اطاعت کے عقیدہ اور قوانین قائم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ دونوں کی تنظیم اسقفی اصولوں پر مبنی ہے۔ دونوں رسولی سلسلہ اور پروہتی حکومت (- Sarerdotal.) کی قائل ہیں۔ دونوں سکرامنٹوں کو مانتی ہیں۔ جہاں تک تواریخی عقائد ناموں کا تعلق ہے دونوں کلیسا میں راسخ العقیدہ ہیں۔ اگر مشرقی کلیسا کو اپنی کٹر تعلیم کی قدامت اور راسخ العقیدگی پر ناز ہے تو مغربی کلیسا اپنی تعلیم کے قدیم سے برحق ہونے اور اس میں کسی قسم کی غلطی کے امکان نہ ہونے پر ناز کرتی ہے۔ اگر مغربی کلیسا کو اپنی جامعیت پر فخر ہے تو مشرقی کلیسا بھی ہر قسم کی بدعت کو اور نافرمانی، عدول حکمی، شوریدہ پشتی کو بیدریغ کچل کر کلیسا کی جامعیت کو ہمیشہ برقرار رکھتی چلی آئی ہے۔ ہر کلیسائی مورخ جانتا ہے کہ مشرقی اور مغربی کلیساؤں میں نہایت معمولی اسباب کی وجہ سے اختلافات پیدا ہوئے اور امتداد زمانہ کے ساتھ یہ اختلافات ایسے بیرونی وجوہ کے باعث بڑھتے گئے جن کا مسیحی تعلیم و تنظیم وغیرہ کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ کیونکہ ان وجوہ میں نسلی امتیازات، سیاسی حالات۔ ذاتی اغراض اور مقامی مفادات کا زیادہ دخل تھا۔ گو کہنے کو اس کا سبب یہ بتلایا جاتا ہے کہ مغربی کلیسا نے روح القدس کا صدور باپ اور بیٹے سے مانا ہے اور مشرقی کلیسا اس کا صدور صرف باپ سے مانتی ہے لیکن ہر مورخ جانتا ہے کہ یہ دونوں کی پھوٹ کا اصلی سبب نہ تھا بلکہ محض ضمنی، اتفاقی اور فوری سبب تھا اور یہ الفاظ اونکھنے کو ٹھیلتے کا بہانہ بن گئے۔ اگر ان ابتدائی صدیوں میں ہندوستان میں ایک زبردست پیٹریارکیٹ ہوتی اور اس کا پیٹریارک علم و فلسفہ، روحانیت اور تدبر کے لئے چار دانگ عالم میں مشہور ہوتا تو یہ عین ممکن تھا کہ وہ اپنے تدبر سے مشرقی اور مغربی کلیساؤں میں مصالحت کرا کے نسلی، سیاسی، ذاتی اور مقامی مفادات کو کلیسا کی

یگانگت اور جامعیت پر غالب نہ آنے دیتا اور آج مسیح کا بدن بٹا ہوا نہ ہوتا بلکہ مشرق و مغرب کے تمام مسیحی ایک واحد مقدس جامع عالمگیر رسولی کلیسیا کے بدن کے منظم اعضا ہوتے۔

(۴)

اگر ہندوستانیوں سے یہ کوتاہی سرزد ہوئی تھی کہ انھوں نے اپنے ملک میں پیٹریارکیٹ قائم نہ کی تو غیر ملکی کلیسیائیں اس کوتاہی کو پورا کر سکتی تھیں۔ بابل کے پیٹریارک اور دیگر کلیسیاؤں کے ذمہ دار کیتھولی کوس اور آرچ بشپ کلیسیائے ہند پر اپنا تسلط قائم کرنے کی بجائے اس کو آزاد اور خود مختار کلیسیا بنا سکتے تھے۔ اور ہندوستانی مسیحیوں کی تقدیس کر کے ان کو خود مختار بشپ قرار دے سکتے تھے اس طرز عمل سے بھی ہمارے ملک میں ایک خود مختار کلیسیا اور آزاد خود مختار ہندوستانی میٹروپولیٹن اور بشپوں کا سلسلہ قائم ہو سکتا تھا اور کلیسیائے ہند کی کمزوری رفع ہو سکتی تھی۔ کلیسیا روز افزوں ترقی کر کے خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی اور طاقت حاصل کر کے فرض شناس ہو کر تبلیغ کے فرض کو ادا کر سکتی تھی۔ وہ اپنے ابنائے وطن کو منجی عالمین کی نجات سے شاد کر سکتی تھی۔ لیکن کسی بدیشی پیٹریارک یا میٹروپالیٹن نے اس طریقہ عمل کو اختیار نہ کیا۔ غیر ملکیوں کی روحانی اور ذہنی غلامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پندرہ صدیوں کے دوران میں ہم کو کسی ایک ہندوستانی مبلغ کا نام نہیں ملتا جس میں مقدس پولوس کا سا دل و دماغ ہوتا اور جس میں رسول کی مانند انجیل سنانے کا سرفروشانہ جوش ہوتا ہم کو ان پندرہ صدیوں کے دوران میں کسی ایک ہندوستانی عالم دینیات کا نام نہیں ملتا جس نے ہندومت یا اسلام پر مسیحی نکتہ نگاہ سے سیر حاصل بحث کی ہو یا مسیحی عقائد و دینیات کی توضیح و تشریح میں کسی جدت سے کام لیا ہو، جس پر آج کے دن کلیسیائے ہند فخر کر سکتی۔ ان پندرہ صدیوں میں اس کلیسیا نے کبھی کوئی ایسا رسول پیدا نہ کیا جس کے بشارت دینے سے اہل ہنود یا اہل اسلام جوق در جوق

مسیحیت میں شامل ہو گئے ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض پردیسی بشپ نہایت
قابل اور روحانی مزاج انسان تھے لیکن وہ بالآخر پردیسی تھے۔ وہ اس قابل نہیں
تھے کہ ہمارے ملک کی زبان۔ رسوم ورواج۔ ہماری تہذیب وثقافت۔ ہمارے
علم وادب۔ ہمارے خیالات وجذبات اور احساسات کو کماحقہ سمجھ سکتے، اور
کلیسیائے ہند کو اُس شاہراہ پر چلا سکتے جس سے وہ ہندومت کے فلسفہ اور مذہب
کے عقائد اور اصطلاحات کے مطالعہ سے ہندوستانیوں کو مسیحِ عالمین کے
قدموں میں جوق درجوق لا سکتی۔ بدیشی بشپوں کو ہندو دھرم کے عقائد اور فلسفیانہ
اصولوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ان کو اس قسم کی تربیت کبھی نہیں دی جاتی
تھی جس سے وہ غیر مسیحی مذاہب وادیان کے حامیوں کے دانت کھٹے کر سکتے، یا
اپنے ماتحت پرسبٹروں اور ڈیکنوں کو اس مقصد کی خاطر تربیت دے سکتے۔ یہی وجہ
ہے کہ ان پندرہ سو سال میں جب کوئی زبردست ہندو شخصیت پیدا ہوئی جس نے
مسیحی عقائد پر حملہ کیا تو کلیسیا میں ارتداد کی رَو بہہ نکلی۔ اور مرتدین کا شمار روز بروز
بڑھتا گیا۔ چنانچہ جنوبی ہند کی روائت کے مطابق کلیسیا کی کمزوری شیومت کے احیا
اور دوبارہ رواج پانے کے سبب ظہور میں آئی جب بے شمار مسیحی مرتد ہو کر دوبارہ
ہندو ہو گئے۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ ارتداد کی لہر وقتاً فوقتاً مابعد کی صدیوں میں بھی رونما
ہوتی جو ملک کے مختلف حصوں میں جاری رہی۔ چنانچہ صوبہ بمبئی کے سرکاری گزٹ[1]
میں ایک جنگلی قبیلہ سہار بھتہ بیدی کا ذکر آتا ہے جس کے شرکا کے نام ثابت کرتے
ہیں کہ وہ کسی زمانہ میں مسیحی تھے۔ سر ولیم ہنٹر[2] کا خیال ہے کہ اس قسم کے ارتداد کی
بہت سی مثالیں موجود ہیں جب بے شمار لوگ مسیحیت سے منحرف ہو کر دیوی دیوتاؤں
کی پوجا کرنے لگ گئے تھے۔ غیر ملکی بشپوں اور پیٹریارکوں کے اس وطیرہ سے
کلیسیائے ہند میں مسیح کی روح کا زندگی بخش دم نہ پھونکا گیا۔

(۵)

اس افسوسناک حالت کا ایک بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی ہند کی کلیسیا نے مسیحیت کا حقیقی مفہوم نہ سمجھا بلکہ اس نے ہندو رت کی طرح کلیسیائی عقیدوں اور ریتوں کی پابندی اور رسموں کی ادائیگی کو ہی سچی دینداری سمجھ لیا۔ وہ اپنی کھال ہی میں مست رہی اور اس بات پر قناعت کرتی رہی کہ غیر مسیحیوں کے درمیان وہ دنیاوی ترقی کرے اور دوسری اونچی ذاتوں کی طرح باعزت زندگی بسر کر کے اپنے مذہب کی رسوم ورواج کو پورا کرتی رہے۔ اور ایک الگ ذات بنی رہے۔

اس روحانی غلامی کی زندہ مثال جنوبی ہند میں عبادت کے وقت سُریانی زبان کا استعمال ہے۔ جنوبی ہند کی کلیسیائیں اپنی عبادت کو سُریانی زبان میں ادا کرتی ہیں جس طرح مسلمان نماز کو عربی زبان میں پڑھتے ہیں۔ کلیسیائی عبادت میں سریانی زبان استعمال کی جاتی ہے کیونکہ ابتدا ہی سے یہ زبان پردیسی نشیوں کی مادری زبان تھی جس کو وہ قدرتی طور پر عبادت میں استعمال کرتے تھے۔ لیکن جنوبی ہند کے مسیحی عوام سریانی زبان سے قطعاً ناواقف ہیں پر یہ زبان خادمانِ دین کے کورس میں شامل ہے کیونکہ یہ ان کی عبادت کی زبان ہے۔ غلامی کی یہ حالت موجودہ زمانہ میں بھی اس تمام برِ عظیم کی کُل کلیسیاؤں کا امتیازی نشان ہے۔ ہندوستان کے طول وعرض میں آج بھی عبادت کے وقت پردیسی زبانیں۔ پردیسی رسوم۔ پردیسی دعاؤں کی کتابیں یا پردیسی گیت۔ پردیسی راگ۔ پردیسی ساز۔ پردیسی شہیدوں کی یادگار کے دن۔ پردیسی کیلنڈر اور ترتیبِ اوراد۔ پردیسی ضابطے قوانین و آئین۔ پردیسی تنظیم۔ پردیسی بشپ غرضیکہ ہر چیز پردیسی ہے اور یہ باتیں کلیسیائے ہند کی روحانی غلامی کے بیرونی اور ظاہری نشانات ہیں۔

اس روحانی غلامی کی وجہ سے ساحلِ مالابار کے سُریانی مسیحی اب بھی

مقدس توما رسول شہید کی شہادت کا روز رجیسا ہم اس سلسلہ کے حصہ اول میں بتلا چکے ہیں ۳ جولائی کے روز مانتے ہیں لیکن اس روز مقدس توما شہید نہیں ہوئے تھے بلکہ آپ کا مبارک لاشہ ہندوستان سے ایڈیسہ پہنچا تھا پس ایڈیسہ کے بشپ نے اس دن کو رسول شہید کا عرس قرار دیدیا تھا۔ موجودہ زمانہ کی وہ ہندوستانی کلیسائیں جن کا تعلق رومی اور انگریزی کلیسیاؤں سے ہے مقدس توما کا تہوار ۳ جولائی کے روز مانتی ہیں۔ کیونکہ مغربی کلیسیا نے رسولِ شہید کی یادگار کے لئے یہ دن مقرر کر رکھا ہے۔ کیا اس سے بدتر غلامی قیاس میں آسکتی ہے؟ اگر مقدس توما رسول کی شہادت کے بعد یہاں ایک خود مختار پیٹریارکیٹ قائم ہو جاتی، اور پیٹریارکوں کا سلسلہ باقاعدہ طور پر مسلسل جاری رہتا تو یہ حالت نہ ہوتی۔ جو کلیسیائیں مقدس رسول نے مشرقی ساحل پر قائم کی تھیں وہ اب تک ختم ہو جانے کی بجائے زبردست اور زندہ کلیسیاؤں کی مرکز ہوتیں اور ہندوستان شرک کی ظلمت اور ضلالت میں پڑے رہنے کی بجائے دنیا کے نور کا پیرو بن کر اقوام عالم کا رہنما ہوتا۔

برِ عظیم ہندوستان کی جغرافیائی وسعت

دوم۔ پہلی پندرہ صدیوں کے دوران میں غیر ممالک کے مسیحی مبلغین بھی ہندوستان جیسے وسیع ملک میں باقاعدہ۔ منظم اور مسلسل طور پر نہ آسکتے تھے اور نہ آئے۔ جہاں کسی صلیب کے عاشق مسیحی دلاور کے دل میں ہندوستان میں بشارت دینے کا جذبہ موجزن ہوا وہ خدا کا نام لے کر اپنے وطن سے صلیب کا علمبردار ہو کر چل پڑا۔ اور ہندوستان جیسے وسیع ملک کے کسی دور افتادہ کونہ میں پہنچ گیا، جہاں اس نے جانفشانی سے مسیحی نجات کی خوشخبری سنائی۔ جب وہاں سے وہ نقل مکانی کر کے انجیل کا پیغام سنانے کی غرض سے ہندوستان کے کسی دوسرے کونہ

عہ ۱۹۵۱ء سے یہ روز ۶ اکتوبر کو منایا جائے گا۔ (برکت اللہ)

میں چلا گیا یا اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا تو اس کا کوئی جانشین نہ ہوا پس ان تبلیغی مساعی میں کوئی تواتر اور تسلسل نہ رہا۔

پردیسی مبلغین نے اپنی تبلیغی خدمت کو سرانجام دینے کی خاطر کوئی ایسی موزوں نکڑ کی جگہیں بھی منتخب نہ کیں جن کو وہ اپنا تبلیغی مرکز بنا کر اپنی مساعی کے دائرہ کو دن بدن وسیع کر سکتے اور جہاں سے مسیحیت ہر چہار سُو قدرتی طور پر پھیل جاتی۔ ہم اس سلسلہ کے پہلے حصہ میں (صلاا۔) میں بتلا چکے ہیں کہ مقدس پولوس کی طرح مقدس توما رسول کی نظرِ انتخاب نے صرف نُکڑ کی جگہیں تجویز فرمائی تھیں، جن کے ذریعہ آپ کثیر التعداد لوگوں کو کلیسیا میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ افسوس کا مقام ہے کہ بعد کے مبلغین آپ کے دانشمندانہ طرزِ عمل پر نہ چلے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی ہند میں مائلاپور اور مالابار کے ساحل کے علاوہ صدیوں تک کسی دوسرے مقام میں ہم کو کوئی مستقل اور منظم جماعتیں نہیں ملتیں جو دیرپا رہی ہوں۔

ان افسوسناک حالات کا ایک ضمنی نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی کلیسیائیں اور مسیحی افراد ملک کی وسعت کی وجہ سے ہر صوبہ اور ہر مقام میں اقلیت کی حیثیت ہی میں صدیوں تک بُود و باش کرتے رہے۔ اور وہ غیر مسیحی اکثریت کے دباؤ کی وجہ سے شکست خوردہ ذہنیت کے شکار ہو گئے۔ مختلف چھوٹی چھوٹی کلیسیائیں فاصلوں کی دوری اور دیگر وجوہ کے باعث اپنے آپ کو منظم بھی نہ کر سکیں جس کی وجہ سے ان پندرہ صدیوں میں ہم کو یورپ کی کلیسیا کی سی کلیسیائی تنظیم اور منگٹمس ہندوستان میں نظر نہیں آتی۔ مغربی کلیسیا کی تنظیم اور سنگٹمٹ نے یورپ کی تاریک قرون میں بھی مسیحیت کی مشعل جلائے رکھی تھی، پس وہ اُس براعظم میں زندہ رہ سکی۔

برِ عظیم ہند کی وسعت کے پیشِ نظر ہندوستانی کلیسیا کی استقامت کے

لئے یہ لازمی بات تھی کہ یا ہندوستانی کلیسیا کی ایک باقاعدہ قدیم ہیرٹ بارگیٹ یہاں قائم ہوتی، یا ہندوستان کے باشندے جوق در جوق مسیحی ہو کر ایک زبردست طاقت بن جاتے اور یا غیر ممالک کے پردیسی مبلغین کا کونہ کونہ میں لگاتار تانتا بندھا رہتا اور ان کی ایک بڑی جماعت بغیر کسی روک ٹوک یا مزاحمت کے متواتر اور مسلسل طور پر ہمارے ملک میں آتی رہتی۔ لیکن ان تینوں شرطوں میں سے ایک شرط بھی پوری نہ ہوئی۔ پہلی دو شرطیں قدرتی اور فطری ہوتیں لیکن تیسری بات نہ صرف مصنوعی، غیر طبعی اور بناوٹی ہے بلکہ ایک ناقابل عمل اور ناممکن شرط ہے بہر حال کسی شرط کے بھی پورا نہ ہونے کی وجہ سے شمالی ہند اور مشرقی ساحل کی کلیساؤں کا نام و نشان تک مٹ گیا اور مغربی ساحل کی کلیساؤں نے تبلیغ کی جانب توجہ نہ کی۔ غیر ملکی مبلغین کی اِکی دُکی عارضی اور اتفاقیہ کوششیں بارور نہ ہوئیں کیونکہ ان کے بیج کو "بہت مٹی نہ ملی" اور چونکہ "اپنے اندر جڑ نہیں رکھتی تھیں بلکہ چند روزہ تھیں وہ جڑ نہ ہونے کے سبب سوکھ گئیں"۔

زبانوں اور نسلوں کے اختلافات

سوم۔ ہمارا ملک ایک برِ عظیم ہے جو مختلف نسلوں اور زبانوں سے بھرا پڑا ہے۔ اور یہ اختلافات مسیحیت کی اشاعت اور ترقی میں زبردست رکاوٹ کا باعث ثابت ہوئے۔ قدیم زمانہ سے یہاں ڈریوڈی نسل کے باشندے رہتے چلے آئے ہیں۔ لیکن ہم یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیا اس نسل کے آباء اجداد ہندوستان کے اصلی باشندے تھے یا کہ وہ بھی بیرونِ ہند کسی جگہ سے آئے تھے اور اصلی باشندوں پر فتح پا کر ہمارے ملک میں بود و باش کرنے لگ گئے تھے۔ ان کے بعد آریہ لوگ شمال مغرب سے اور منگول شمال مشرق کی جانب سے آئے۔ آریہ نسل کے لوگ

دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں ۔ پنجاب ۔ سندھ اور راجپوتانہ کے شمال مغربی حصہ میں پائے جاتے ہیں لیکن دریائے گنگا کے شمالی رقبہ میں اور اس تمام خطۂ زمین میں جس کو دریائے گنگا اور اس کے معاون دریا سرسبز کرتے ہیں (جن میں صوبہ جات متحدہ اور صوبہ بہار کا وہ حصہ جو بنگال سے ملحق ہے شامل ہیں) وہ لوگ پائے جاتے ہیں جو آرین ڈریوڈی ہیں ۔ دریائے برہم پُتر اور گنگا کے جنوبی رقبہ میں (جن میں بنگال اور مشرقی بنگال کے صوبے ہیں) منگولی ڈریوڈی نسل کے لوگ آباد ہیں ۔ جنوبی بہار میں ڈریوڈی نسل کے لوگ سکونت کرتے ہیں اور مغربی ساحل میں سکدی ۔ ڈریوڈی نسل کے لوگ رہتے ہیں ۔ اور بلوچستان اور اس کے شمال کی جانب تُرکی ایرانی نسل کے لوگ آباد ہیں ۔

نسلوں کے اختلاف کا قدرتی نتیجہ زبانوں کا اختلاف ہے ۔ ان اختلافات کو اسلام اور ہندو مذہب کے تاثرات نے دوبالا کر دیا ہے چنانچہ شمالی ہند[۵] کے شمال کی بڑی بڑی زبانیں بنگالی ۔ اڑیہ ۔ بہاری ۔ ہندی ۔ راجستھانی ۔ سندھی ۔ اُردو اور پنجابی ہیں ۔ ان کے علاوہ متعدد مقامی زبانیں بھی ہیں ۔ ہندوستان[۵] کی شمال مشرقی سرحد پر کم از کم چھپن[۵۶] زبانیں اور شمال مغربی سرحد پر نصف درجن کے قریب زبانیں بولی جاتی ہیں ۔ ہندوستان کے باقی ماندہ حصوں کی بڑی بڑی زبانیں گجراتی ۔ مرہٹی ۔ تیلگو ۔ کناری ۔ ملے آلم اور تامل ہیں ۔ ان کے علاوہ متعدد مقامی زبانیں پائی جاتی ہیں ۔

پس برِّ عظیم ہندوستان میں کوئی ایک زبان نہیں تھی جو ہندوستان کے

---

۵ الفاظ " ہندوستان " " ہند " " برِّ عظیم " میں وہ صوبے بھی شامل ہیں جو اب پاکستان میں ہیں ۔ (برکت اللہ)

طول و عرض میں بولی جاسکتی اور جس کو مسیحی مبلغین مسیحیت کی اشاعت کا وسیلہ بنا سکتے۔ ہمارے ملک میں بابل کی بولیوں سے بھی زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ چونکہ خود ہندوستان کے مختلف حصص میں کوئی خود مختار اور آزاد کلیسیائیں قائم نہیں تھیں جو اپنی زبانوں میں غیر مسیحیوں کو نجات کا پیغام دیتیں اور غیر ملکی مبلغین شاذ و نادر ہی مختلف زبانیں بولنے پر قادر ہوتے تھے لہذا قدرتی طور پر زبانوں کے اختلافات کے باعث مسیحیت کا نجات بخش پیغام ہندوستان کے طول و عرض میں نہ پہنچ سکا۔ مغربی کلیسیا کو یورپ میں یہ دقت پیش نہ آئی تھی کیونکہ رومی سلطنت نے یورپ کے تمام ممالک کو ایک ہی زبان دے رکھی تھی اور اس امر نے مغربی ممالک میں مسیحیت کی اشاعت کرنے میں بڑی مدد دی تھی۔

نسلوں اور زبانوں کے اختلافات کی وجہ سے اس برعظیم ہندوستان[۵] کے مختلف باشندوں کے رہنے سہنے۔ طرز رہائش اور زندگی۔ رسوم و رواج۔ ثقافت اور کلچر۔ ذہنیت اور مذاہب وغیرہ وغیرہ کے اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ ان میں سے ہر ایک امر جداگانہ طور پر کسی ملک میں مسیحیت کی اشاعت کی راہ میں سخت رکاوٹ کا باعث ہوسکتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں یہ تمام کے تمام اختلافات ایک ہی جگہ پائے جاتے ہیں پس ان اختلافات کی کثرت کی تناسب کے مطابق مسیحیت کی اشاعت میں رکاوٹوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ مثال کے طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب، کلچر، ذہنیت وغیرہ میں اس قدر فرق ہے کہ کوئی ایک تبلیغی انجمن تبلیغ کا فرض دونوں میں کماحقہ ادا نہیں کر سکتی۔

---

۵ الفاظ "ہندوستان" "ہند" "برعظیم" میں وہ صوبے بھی شامل ہیں جو اب پاکستان میں ہیں۔ (برکت اللہ)

ذات پات کی بندش

چہارم — ہندوستان میں ذات پات کی قیود مسیحیت کی اشاعت کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بن گئیں۔ ذات پات کے اصول مسیحیت کے اصول اخوت و مساوات کے عین ضد ہیں۔ ایسا کہ اُن کا ایک جا ہونا غیر ممکن ہے۔ جو سوسائٹی ذات پات کے اصول پر قائم ہے اُس میں مسیحیت کی نشوونما اور اشاعت نہیں ہو سکتی۔ مسیحیت کُل بنی آدم کو اخوت و مساوات کی لڑی میں منسلک کر دیتی ہے لیکن ذات پات بنی نوعِ انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ کہنے کو تو ہندومت میں چار ذاتیں ہیں لیکن ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس برِعظیم میں دو ہزار تین سو اٹھتر (۲۳۷۸) بڑی ذاتیں ہیں۔ اور بڑی چھوٹی ذاتیں سب ملا کر ایک لاکھ کے قریب ہیں۔ صرف برہمنوں کی ایک ہزار آٹھ سو چھیاسی (۱۸۸۶) ذاتیں ہیں۔ جنوبی ہند میں جن مشکلات کا مسیحیت کو سامنا کرنا پڑا ہے ہم ان کا اندازہ اس امر سے کر سکتے ہیں کہ وہاں کی چھوٹی سی ریاست کوچین میں جہاں مسیحیوں کی اکثریت ہے چار سو بیس (۴۲۰) ذاتیں پائی جاتی ہیں[۳] اور ہر ذات کے اصول یہ ہیں کہ ہر شخص اپنی ذات کے اندر ہی شادی بیاہ کر سکتا ہے۔ اور صرف ایسا کھانا کھا سکتا ہے جو اس کی ذات برادری کے آدمی نے پکایا ہو یا اس سے کسی بڑی ذات کے آدمی نے بنایا ہو۔ وہ اپنے سے نچلی ذات کے کسی آدمی کے ساتھ ملنے یا اس کے نزدیک ہونے سے ناپاک ہو جاتا ہے۔ ذات کی یہ قیود نہ صرف ہر شخص کی زندگی کے تمام پبلک شعبوں پر حاوی ہوتی ہیں بلکہ ہر شخص کی پرائیویٹ زندگی میں جاری اور ساری ہیں۔ ذات کے تمام اشخاص ایک ہی مذہب اور مت کے پیرو ہو سکتے ہیں پس اگر کوئی شخص شرک اور بُت پرستی کو ترک کر کے ہندومت کو چھوڑ دے اور مسیحیت کو اختیار کر لے تو اس جرأت اور دلیری کی وجہ سے وہ ذات برادری سے خارج کر دیا جاتا ہے اور

گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ دہ دانہ پانی تک سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس کے والدین اور عزیز و اقارب اس کی جان کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ اس کو حبس بے جا میں رکھا جاتا ہے اور بعض اوقات جان سے مارا جاتا ہے۔ اندریں حالات ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ مسیحیت اس قسم کے اصول رکھنے والی سماج کی فضا میں پھل پھول نہ سکی۔

جنوبی ہندوستان کی کلیسیا کی کمزور اور نحیف زندگی کا سب سے بڑا سبب وہ مصالحت تھی جو اس نے دانستہ یا نادانستہ طور پر ہندو مت سے کرلی۔ ہم نے گذشتہ ابواب (دوسرے باب کی تیسری فصل اور چھٹے باب کی تیسری فصل) میں اُن حقوق کا ذکر کیا ہے جو کلیسیا کو مختلف راجاؤں نے مختلف اوقات پر عطا کئے تھے۔ یہ حقوق کلیسیا کے گلے میں چکی کا پاٹ ثابت ہوئے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے کلیسیا ایک مستقل اونچی ذات بن گئی۔ برہمنوں نے ان حقوق کے ذریعہ جنوبی ہندوستان کی سماج کو آرین ڈھانچہ میں ڈھال کر کلیسیا کو اس سماج کا ایک مستقل جزو بنا لیا۔ شمالی ہند میں چار ذاتیں تھیں یعنی برہمن۔ کشتری۔ ویش اور شودر لیکن جنوبی ہند میں صرف برہمن اور شودر تھے۔ یہاں کے راجے نائر خاندان کے تھے جو شودر ذات کے تھے۔ پس برہمنوں نے نائروں کو کشتریوں کا درجہ دے دیا۔ اور وہ کشتریوں کے فرائض ادا کرنے لگ گئے۔ جب برہمنوں نے دیکھا کہ مسیحی مہاجر جو غیر ممالک سے آئے ہیں وہ تجارت پیشہ ہیں اور وسیع پیمانہ پر سمندر پار کی تجارت کرتے ہیں جس سے ملک کو فائدہ حاصل ہوتا ہے انہوں نے کلیسیا کو حقوق دے کر ان کو ویش کا درجہ دے دیا اور یوں مسیحی ایک مستقل ذات بن گئے۔ ان سیاسی حقوق کے باعث وہ پنچ ذات کے لوگوں کے ذمی۔ محافظ اور نگران بن گئے۔ پنچ ذاتیں ان کے قبضۂ اختیار میں آگئیں اور وہ ان کو ہندوؤں کی طرح حقارت کی نظر سے دیکھنے لگ گئے۔ یہ پنچ ذات کے لوگ بھی

مسیحیوں کو اونچی ذات کے لوگ تصور کرنے لگ گئے۔ کلیسیا کے اندر بھی اونچی ذاتوں کے ہندوؤں کی طرح خوراک کی قیود، اور پابندیاں۔ رسمی ناپاکی چھوت چھات وغیرہ جیسی لعنتی باتیں داخل ہوگئیں۔ اندریں حالات جنوبی کلیسیا کے وہم وگمان میں بھی نہ آیا کہ دیگر اقوام کو بالخصوص نیچ ذات کے لوگوں کو انجیل جلیل کی خوشخبری دے کر اپنے اندر شامل کریں۔ پس ذات پات کا وجود کلیسیا کے اندر اور باہر مسیحیت کی اشاعت میں نہایت زبردست رکاوٹ ثابت ہوا۔

گذشتہ باب میں ہم بتلا چکے ہیں کہ ساحلِ مالابار پر اسلام کی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اس کو اچھوت ذات کے لوگوں نے ذات پات کی قیود سے چھٹکارا پانے کی خاطر قبول کیا تھا۔ جب نیچ ذات کے لوگوں نے دیکھا کہ ان کی برادری کے نومریدوں سے اسلام میں اچھا سلوک کیا جاتا ہے تو وہ لوگ جوق در جوق مسلمان ہوگئے۔ واجب تو یہ تھا کہ مسیحیت کی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر جنوبی ہند کی کلیسیا ذات پات کی پابندیوں کو سرے سے مٹا دیتی۔ لیکن اس نے ان غیر فطرتی اور انسانیت سوز امتیازات کو جو مسیحی اصولِ اخوت و مساوات کی منافی تھیں، نابود کرنے کی بجائے اپنا لیا۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحیت کی اشاعت بند ہوگئی اور کلیسیا خود دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی۔

ہندومت کی خصوصیت

پنجم۔ جنوبی ہندوستان میں مسیحیت کی ترقی کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ خود ہندومت کی خصوصیت تھی۔ مشرق و مغرب کے دیگر ممالک میں مسیحیت کو تقطبت پرستی، مشرکانہ رسمیات، اوہامِ باطلہ اور دیگر توہمات سے ہی سابقہ پڑا تھا، لہٰذا ان ممالک میں اس نے باآسانی تمام جلدی فتح حاصل کرلی۔ ہندوستان میں بھی ابتدائی قسم کے مذاہب موجود

تھے جن میں مظاہر قدرت اور سنگ و شجر وغیرہ کی پرستش اور اشیائے فطرت کی پوجا کی جاتی تھی لیکن چونکہ وہ ہندوستان کے سماجی ڈھانچہ میں منظم ہو کر اس کا جزو لاینفک ہو چکے تھے لہذا اُن کے پاؤں مسیحیت کے سامنے نہ اُکھڑے۔ دیوی دیوتاؤں کی پرستش جیسے ادنیٰ قسم کے خیالات اور ابتدائی قسم کے متعدد عقائد ایک ایسی کلچر کا حصہ تھے جو ذات پات کے تانے بانے میں منظم کی گئی تھی۔ پس مسیحیت اُن پر آسانی سے غالب نہ آسکی۔

علاوہ ازیں ہمارے ملک میں مسیحیت کو ایک ایسے مذہبی، روحانی اور فلسفیانہ مت کے ساتھ پالا پڑا جس نے فلسفہ کے ذریعہ خدا۔ انسان اور کائنات کے مختلف پیچیدہ مسائل پر صدیوں پہلے توجہ دے رکھی تھی اور جس کے کوئی مخصوص عقائد نہیں تھے۔ ہندومت میں ہر رنگ اور خیال کے اعتقادات ہمدوش ہو کر صلح اور آشتی کے ساتھ رہتے تھے جس کی وجہ سے ہندومت ہر قسم کے عقیدے اور مذہب کو اپنے اندر جذب کر لیتا تھا۔ پس قدرتی طور پر مسیحیت کو ہندومت پر غالب آنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں رتی بھر شک نہیں کہ انجیل جلیل کی تعلیم کی وجہ سے ہندومت میں ان پندرہ صدیوں کے دوران میں مختلف قسم کی اصلاحیں وقوع پذیر ہوئیں جن کا مفصل ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان اصلاحات کی وجہ سے بے شمار لوگ ہندومت کے حلقہ میں ہی رہ گئے اور خداوند مسیح کے قدموں میں نہ آئے۔

ہم جو دورِ حاضرہ میں رہتے ہیں ان وجوہات اور مشکلات کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انیسویں اور بیسویں صدی میں ہزاروں مسیحی مبلغین باقاعدہ اور مستقل طور پر نہایت استقلال۔ حوصلہ مندی اور بلند ہمتی کے ساتھ مباحثوں، مناظروں۔ کتابوں اور دیگر ذریعوں سے ہندومت پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔

لیکن جب ہم تعلیم یافتہ ہندوؤں میں سے نو مریدوں کی تعداد کی طرف نظر کرتے ہیں، تو ان مساعیٔ جمیلہ کے نتائج بہت تسلی بخش ثابت نہیں ہوتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان پے در پے حملوں کی وجہ سے ہندو مت کے مذہب۔ عقائد۔ دینیات رسمیات۔ فلسفیانہ خیالات وغیرہ میں بیسیوں اصلاحیں نمودار ہوگئی ہیں جن کے باعث بے شمار ہندو منجی عالمین کی نجات سے محروم رہ گئے ہیں۔ جب بیسویں صدی کا یہ حال ہے تو جائے حیرت نہیں کہ پہلی پندرہ صدیوں میں (جب کلیسیا میں نہ تبلیغی جوش تھا اور نہ اس میں دینیات کے عالم اور ہندو فلسفہ کے ماہر تھے) مسیحیت نے ہندوستان میں کوئی نمایاں ترقی نہ کی۔ ہمارے لئے یہ شکر کا مقام ہے کہ پردیسی مبلغین کی ان تھک کوششوں نے مسیحیت کے چراغ کو ان تاریک صدیوں میں روشن رکھا اور کہ مسیحیت جنوبی ہند کی کلیسیا کی مصالحت آمیز روش کی وجہ سے ہندو مت میں جذب نہ ہوگئی۔

جہاں تک مسیحیت کی اشاعت کا تعلق ہے تاریخ عالم کی روشنی میں ہم ہندوستان اور مغربی ممالک میں عظیم فرق پاتے ہیں۔ جب ہم ممالک یورپ کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ پہلی پانچ صدیوں کے اندر اندر مسیحیت تمام مغربی ممالک میں پھیل گئی تھی۔ اس نے پہلی پندرہ صدیوں میں یورپ کے براعظم میں ایسا گھر کر لیا تھا کہ اس کے کسی ملک کی ... کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو انجیل جلیل کی تعلیم سے متاثر نہ ہوا تھا۔ کلیسیا یورپ کے ہر ملک کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھی۔ بالفاظ دیگر مسیحیت نے یورپ کے تمام ممالک کو ان صدیوں کے دوران میں کامل طور پر فتح کر لیا تھا لیکن ہندوستان میں پہلی پندرہ صدیوں میں مذکورہ بالا وجوہ کے باعث مسیحیت کی اشاعت نہ ہوئی اور کلیسیا کی روحانی حالت ہمیشہ کمزور رہی جس کے باعث اس کی سچی زندگی، روحانیت کی ابتدائی منازل

سے آگے نہ بڑھی۔

ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں جنوبی ہند نے بہت نمایاں حصہ لیا ہے، کیونکہ شمالی ہند کی نسبت جنوبی ہند میں لوگ سکون اور طمانیت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ جنوبی ہندوستان مدت تک بیرونی حملوں اور اندرونی انقلابوں سے آزاد رہا تھا۔ پس اگر مسیحی کلیسیا اپنے تبلیغی فرائض کو ادا کرنے کی خاطر کمر بستہ رہتی تو کم از کم جنوبی ہندوستان کے بے شمار باشندے مسیحی نجات سے بہرہ ور ہو کر منجئ عالمین کے قدموں میں آسکتے تھے۔ اور کلیسیا نیم جان زندگی بسر کرنے کی بجائے ہر جگہ سرسبز اور شاداب ہو کر، تمام ملک کے لئے برکت کا باعث بن سکتی تھی۔

بابِ نہم

مسیحیت کا خمیر اور ہندو دھرم

فصلِ اول

ہندو دھرم کی کتابیں اور مسیحیت

گذشتہ باب میں ہم بتلا چکے ہیں کہ ہندوستان کی کلیسیا کی مختلف کمزوریوں نے خداوند مسیح کو ہندوستان پر فاتح ہونے نہ دیا۔ لیکن ہمارے ملک کی تاریخ ہم پر واضح کر دیتی ہے کہ کلیسیا کی مجرمانہ کوتاہی اور غفلت کے باوجود انجیل جلیل کی تعلیم اور منجیٔ عالمین کی زندگی اور موت نے ہندو دھرم کے معتقدات۔ رسمیات اور فلسفیانہ خیالات پر نمایاں طور پر گہرا اور مستقل اثر ڈالا۔ یہ ناممکن تھا کہ دنیا کا نور تاریکی میں چمکتا اور اس کی تابدار شعاعیں ظلمت پر اثر نہ کرتیں۔ پس گو مسیحیت کی روشنی ان پندرہ صدیوں میں دھیمی رہی اور بعض اوقات ٹمٹماتی رہی تاہم اس کے جلالی اصول اپنا اثر کئے بغیر نہ رہے۔ جو لوگ غور و فکر کرنے کے عادی تھے وہ مسیحیت کی جانب مائل ہو گئے جس طرح موجودہ زمانہ میں مسیحی تعلیم کی وجہ سے ہندو دھرم میں اصلاح ہو رہی ہے اور ہندو مذہب انجیل کی بجائے گیتا کو اور

مسیح کی بجائے کرشن کو مقبولیت عامہ کے لئے پیش کرتا ہے تاکہ ہندو اپنے مذہب کو ترک نہ کریں اُسی طرح قدیم زمانہ میں جنوبی ہند میں ہندو دھرم کے مصلح اُٹھے۔ جنہوں نے انجیل جلیل کی روشنی میں اپنے مذہب اور فلسفہ کی اصلاح کرنے کی از حد کوشش کی تاکہ عوام الناس مسیحیت کو اختیار کرنے سے باز رہیں۔

ہندو دھرم مختلف صدیوں میں حالاتِ زمانہ کے مطابق مختلف صورتیں اختیار کرتا اور بدلتا رہا ہے۔ چنانچہ مسیح سے دو ہزار سال پہلے ہندو دھرم اشیائے فطرت اور مناظر قدرت کی پرستش کا نام تھا۔ اس کے قریباً ایک ہزار سال بعد ہندو مذہب نے فلسفیانہ صورت اختیار کر لی۔ منجئ عالمین کی بعثت کے زمانہ میں محبت کے عنصر نے ہندو دھرم میں نشو و نما پائی۔ جب ہم اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہیں کہ آنخداوند کا شاگرد مقدس توما اسی زمانہ میں ہندوستان آئے تھے تو ہم اُن اسباب کو سمجھ سکتے ہیں۔ جن کی وجہ سے محبت کے عنصر نے ہندو دھرم میں جگہ حاصل کر لی۔ لیکن گو بظاہر اصولِ محبت نے ہندو مذہب میں مستقل جگہ حاصل کر لی تاہم چونکہ یہ دھرم آواگون۔ تناسخ اور کرم کے اصولوں کا قائل تھا لہذا وہ مدتِ مدید تک ایمان اور امید کے سُنہری اصولوں سے ناآشنا رہا۔

گذشتہ دو ہزار سال کے عرصہ میں انجیل جلیل کی تعلیم نے ہندو مذہب کی اُن کتب پر خاص اثر ڈالا جو اب مقبولِ خلائق ہیں۔ اس بات کے ثبوت میں ہم مہابھارت اور بھگوت گیتا کو پیش کرتے ہیں۔

مہابھارت اور مسیحیت

اہل ہنود میں مہابھارت کو ایک بلند پایہ حاصل ہے۔ علمائے مغرب نے جو ادبی تنقید کے اصول میں مہارت تامہ رکھتے ہیں اس کتاب کے مختلف حصوں کی نسبت تحقیق کی ہے اور اندرونی

اور بیرونی شہادت کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ کتاب پانچسو سال قبل مسیح سے ۵۰۰ء سن عیسوی کے درمیان یعنی ایک ہزار سال کے دوران میں لکھی گئی ہے۔ ابتدائی زمانہ میں اس میں آٹھ ہزار آٹھ سو (۸۸۰۰) شلوک تھے۔ بعد میں اس کتاب میں پانڈو اور کرشن کے حصص (جن میں کرشن ایک اردھ دیو یا نیم دیوتا کا درجہ رکھتا ہے) ازاد کئے گئے۔ اور یہ کتاب چوبیس ہزار شلوکوں پر مشتمل ہوئی۔ چنانچہ پانٹر ینی کے زمانہ تک اس میں ۲۴۰۰۰ شلوک تھے۔ اس کے تیسرے اور آخری دور میں کرشن کو پُورن دیو یا پورا دیوتا بنا دیا گیا اور اس میں نصیحت آموز باتیں داخل کی گئیں۔ یہ دور مسیح سے دو صدیاں پہلے شروع ہوا اور پانچویں صدی مسیحی تک رہا۔

مہا بھارت کے ایک مقام میں تین یاتریوں کا ذکر ہے۔ یہ یاترا انھوں نے "شویت دیپ" یعنی سفید جزیرہ میں کی تھی۔ گمان اغلب ہے کہ مندرجہ ذیل بیان کسی مسیحی گرجاگھر کی عبادت کا منظر ہے:۔

"پھر ہم نے سفید اور نورانی انسانوں کو دیکھا جو چاند کی طرح شُبھ لباس اور چِھنہ نشانوں سے آراستہ تھے۔ وہ ہاتھ باندھے پرمیشور کے حضور میں پورب جانب منہ کرکے پرارتھنا کرتے تھے۔ اس پرارتھنا کو جو یہ مہاتما پرش کرتے تھے "مانسک پرارتھنا" یا ذہنی دعا کہتے ہیں...... تب ہم نے ایک زبردست روشنی دیکھی جو چاروں طرف پھیل گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا ہزاروں سورج یکدم چمکنے لگ گئے ہیں یہ مہاتما پرش اس نور کی طرف بڑھے اور انھوں نے بلند آواز سے بڑی خوشی کے ساتھ اس کا سواگت کیا۔ جب ہم نے ان کی

آواز کو سنا تو معلوم ہوا کہ وہ نارائن کی آرتی یا حمد و تعریف کر رہے
تھے۔ ہم اس نور کے جلال سے ایسے بے خود ہو گئے کہ ہم کو نہ
کچھ سُوجھ بُوجھ رہی اور نہ کچھ دیکھ سکے۔ لیکن ہم نے ایک اونچی
آواز سنی جو یہ کہتی تھی کہ "اے تو جس کی آنکھیں کنول کی مانند
ہیں تو ہی اکیلا فاتح دھے وان ہے۔ اے برہمانڈ کے مالک
صرف تیری ہی جے ہو۔ اے پرماتما کے جیشٹھ اور پرکھم پتّیر۔
تیری جے ہو۔" اس آواز کے بعد اپدیش ہوا۔ اور اس کے
نرمل اور سُگندھ بھت وائیو چل رہی تھی جو اپنے ساتھ سوُرگیہ
پھول اور روگ ناشک دوائیاں لائی۔"

(مہا بھارت ۱۲:۱۲)

مذکورہ بالا بیان غالباً مسیحی پاک رفاقت کی عبادت کا بیان ہے جو اُن
یاتریوں نے کسی گرجا گھر میں دیکھی ہوگی جس "شویت دویپ" یعنی سفید جزیرہ
کا یہ یاتری ذکر کرتے ہیں وہاں کے باشندے سفید رنگ کے تھے جن کے
درمیان بھگتی کے ایسے خیالات پائے جاتے تھے جو ہندوستان میں رائج نہیں
تھے۔ ڈاکٹر گرائرسن کا خیال ہے[۲] کہ غالباً ان یاتریوں نے کوہ ہندوکش کے
شمال کی جانب وسط ایشیا کی کسی کلیسیا کی یا بکتریا کی مسیحی کلیسیا کی عبادت کو
دیکھا ہوگا۔ ڈاکٹر سیل (-Seal.) کہتے ہیں کہ "میری رائے میں یہ
واقعہ قطعی طور پر ثابت کرتا ہے کہ بعض ہندو جو وشنو مت کے پیرو تھے سفر کر کے
مصر یا ایشیائے کوچک کے ساحل پر گئے اور مسیحیت کی عبادت کو دیکھا۔ ڈاکٹر
ویبر (-Weber.) بھی یہی کہتا ہے لیسن (-Lassen.)
بھی ان فضلاء کے ساتھ اتفاق کر کے کہتا ہے کہ بعض برہمنوں نے ہندوستان

کے شمال مغرب کے کسی ملک میں مسیحیت کی رسوم کو دیکھا تھا اور وہ ہندوستان میں بعض مسیحی عقائد کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ یہ ملک پارتھیا (شمال مغربی پنجاب) ہے جہاں روایت کے مطابق مقدس توما نے انجیل کا پرچار کیا تھا۔ "شویت دویپ" اس زمانہ کے جغرافیہ کے مطابق ہندوستان کا وہ حصہ تھا جو میرو پربت سے شمال کی جانب واقع ہے[۳۱]۔ پروفیسر گارب کے خیال میں یہ جگہ جھیل بالکش ہے جس کے کرگی نام کے معنی "سفید سمندر" ہے اور جس کا تعلق وسط ہند کے اہم تجارتی مرکزوں سے تھا۔

علاوہ ازیں مہابھارت کے بعض حصے ایسے ہیں جو خداوند مسیح کی پیدائش کے بعد لکھے گئے تھے۔ ان حصوں میں بعض ایسے الفاظ اور فقرے پائے جاتے ہیں جو اناجیلِ اربعہ اور بالخصوص مقدس یوحنا کی انجیل سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ہاپکنس نے ان میں سے بعض کو اپنی کتاب میں جمع کیا ہے[۳۲]۔ ہم یہاں صرف دو حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ ایک مقام میں کرشن کی نسبت کہا گیا ہے۔ کہ

"وہ اپنے گلہ کا نگہبان ہے۔ وہ گناہ سے مبرا[۳۳] ازروش اور نشپاپ خدا ہے۔ گو وہ دنیا کا خداوند ہے تاہم وہ مرنے پر رضامند ہُوا تا کہ جو باتیں رشیوں کی معرفت کہی گئی تھیں پوری ہوں۔"

ایک اور مقام میں اس کی نسبت کہا گیا ہے کہ

"وہ خدا کا اوتار ہے جو خلق نہیں ہوا بلکہ انادی ہے۔ وہ قدیم الایام ہے اور خدا کا اکلوتا بیٹا ہے جو ایک کنواری سے پیدا ہوا۔ اس کا اور خدا کا ایک ہی جوہر ہے۔"

مہابھارت میں کرشن کے برہمنوں کے پاؤں دھونے کا ذکر بھی آیا ہے[۳۴]۔

بھگوت گیتا کی تاریخ تصنیف

ڈاکٹر بارنٹ بھگوت گیتا کے انگریزی ترجمہ کی تمہید میں بجا فرماتے ہیں کہ:-

"گذشتہ دو ہزار سال کے عرصہ میں ہندوستان کے کروڑوں ہندوؤں نے بھگوت گیتا کو سنا یا پڑھا ہے۔ اس کتاب نے ان کو یہ امید اور ڈھارس دی ہے کہ ان کی خدا تک رسائی ہو سکتی ہے۔ ان کا یہ ایمان بے فائدہ ثابت نہیں ہوا کیونکہ اس کتاب میں یہ خوشخبری پائی جاتی ہے کہ خدا کی بے غرضانہ خدمت کی خاطر انسان کو اپنی زندگی کے ہر شعبہ کی تقدیس کرنی چاہیے۔ اس میں ایک ایسی لازوال محبت کا ذکر پایا جاتا ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ اپنے لا محدود فضل کو اُن سب کے لئے انڈیل دیتی ہے جو اس کی تلاش کرتے ہیں[۵]۔"

بھگوت گیتا کی تاریخ تصنیف میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ ایک نہایت قدیم کتاب ہے۔ بمبئی کے مشہور و معروف عالم تلنگ اور ڈاکٹر بھنڈارکر کے خیال میں گیتا تیسری یا چوتھی صدی قبل از مسیح لکھی گئی تھی[۶]۔ لیکن اگر یہ بات صحیح ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس پایہ کی کتاب کا اثر سنسکرت کے قدیم علم ادب پر ضرور پڑتا۔ پر حیرت کی بات یہ ہے کہ کالیداس کی تصنیفات سے پہلے سنسکرت کی کسی کتاب میں گیتا کی طرف اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔ کالیداس واقعہ کورو کشیتر کے چودہ یا سولہ صدیاں بعد ہوا ہے کیونکہ وہ پانچویں صدی مسیحی کے پہلے نصف میں تھا۔ اُس کے زمانہ کے بعد گیتا کا ذکر اکثر پایا جاتا ہے اور اس پر بے شمار تفسیریں بھی لکھی گئیں۔ اگر گیتا جیسی عظیم الشان کتاب کا اس زمانہ سے پہلے ذکر نہیں ملتا تو اس معنی خیز خاموشی سے ہم یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس کی

قدامت محض ایک افسانہ اور عام ہندوؤں کی خوش اعتقادی کی ایک مثال ہے۔

(۲)

اس نظریہ کو کہ گیتا کوئی قدیم کتاب نہیں کتاب کی اندرونی شہادت سے بھی تقویت پہنچتی ہے۔ گیتا میں کرشن برہم کا اوتار ہے اور کتاب کی تعلیم اسی مرکزی خیال کے گرد گھومتی ہے۔ پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اعتقاد کا ہندو خیالات کے کس دور کے ساتھ تعلق ہے۔ یہ اعتقاد ویدوں میں نہیں ملتا۔ قدیم اُپنشدوں اور براہمنوں میں بھی یہ خیال نہیں پایا جاتا۔ یہ عقیدہ سُوتروں یا سُوتروں کے زمانہ کے اپنشدوں میں بھی نظر نہیں آتا۔ اس قسم کا اعتقاد پہلی مرتبہ مہابھارت کے تیسرے دور میں (جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں) پایا جاتا ہے اور اتھروی اُپنشدوں میں دکھائی دیتا ہے پس سنسکرت کی کتابوں میں پہلی دفعہ اوتاروں کا عقیدہ اس دور میں پایا جاتا ہے جو مسیح سے دو صدیاں پہلے شروع ہوا اور پانچ صدیاں بعد ختم ہوا۔

پس گیتا مہابھارت کا ایک حصہ ہے جو مابعد کے زمانہ کا ہے۔ ٹالبائیز وہیلر (Talboys Wheeler.) کہتا ہے کہ یہ ایک غیر قدرتی بات ہے کہ جنگ کے پہلے روز جب دونوں افواج صف آرا ہوں اور لڑائی شروع ہونے والی ہو تو ایسے نازک موقعہ پر کرشن اور ارجن فلسفیانہ امور اور مُکتی وغیرہ کی بحث میں اُلجھیں۔ جسٹس تلنگ اس کے ساتھ بعض باتوں میں متفق ہو کر کہتا ہے "بھگوت گیتا درحقیقت ایک الگ کتاب ہے جس کو مہابھارت کے مؤلف نے اپنی مقصد برآری کی خاطر اپنا لیا ہے۔ ایسے وقت پر فلسفیانہ بحث بے موقعہ اور بے محل ہے۔" ڈاکٹر گاربے (Garbe.) کے ساتھ ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ گیتا کے قدیم حصے مسیح سے دو سو سال پہلے کے ہیں۔ لیکن اس کی موجودہ

صورت ۲۰۰ء سنِ عیسوی کی ہے شے

(۳)

پروفیسر گاربے کا خیال ہے کہ بھگوت گیتا کے فلسفیانہ خیالات کی بنیاد سانکھیہ اور یوگ پر ہے اور ان کے مقابلہ میں ویدانت کو دوسری جگہ حاصل ہے۔ اگر ہم گیتا پر محض اس کے فلسفیانہ پہلو سے نگاہ ڈالیں تو ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ سانکھیہ اور یوگ کے خیالات میں اور ویدانتی خیالات میں باہمی تضاد ہے جو صرف گیتا کی قدیم اور جدید صورتوں میں تمیز کرنے سے ہی دور ہو سکتا ہے۔ گیتا میں ویدانتی فلسفہ اصلی نظم کا حصہ نہیں ہے۔ خواہ ہم اس کے فلسفیانہ خیالات کو پرکھیں، خواہ ہم اس کے مذہبی عقائد کی جانچ پڑتال کریں۔ دونوں پہلوؤں سے ہم اسی ایک نتیجہ پر پہنچتے ہیں[۹]"

حق تو یہ ہے کہ موجودہ گیتا میں جو باتیں کرشن کے منہ سے نکلی ہیں وہ ہمہ اوستی نظریہ۔ توحید، فلسفیانہ خیالات اور بھگتی خیالات کا ایک طرفہ معجون ہیں۔ گیتا میں کرشن ایک شخصیت رکھنے والا خدا ہے جس میں شخصی صفات موجود ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ایک غیر متشخص برہم بھی دوش بدوش نظر آتا ہے جو وجودِ مطلق ہے۔ ایک طرف تو کرشن اپنی نسبت کہتا ہے کہ وہ اکیلا واحد خدا ہے جو دنیا کا خالق اور سب پر حکمران ہے۔ دوسری طرف وہ برہم اور مایا کے ویدانتی عقائد کی تلقین کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ انسانی زندگی کا حقیقی مقصد برہم کے ساتھ ایک ہو جانا ہے۔ تمام کتاب میں دونوں قسم کے عقائد ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اور یہ کہیں بتلایا نہیں گیا کہ دونوں میں سے کونسا عقیدہ اعلیٰ پایہ کا ہے اور کونسا ادنیٰ قسم کا ہے۔ اور نہ کہیں دونوں متضاد عقائد میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم کو یہ بھی بتلایا نہیں گیا کہ ویدانت کے ہمہ اوستی خیالات اصل حقیقت کے مطابق ہیں اور توحیدی خیالات صرف مبتدیوں کے لئے ہیں۔ اس کے برعکس تمام کتاب میں دونوں قسم کے خیالات کو

یکساں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ چنانچہ گاربے کہتا ہے۔ " گیتا میں توحیدی یا آستک اور ہمہ اوستی عقائد ایک دوسرے سے خلط ملط ہیں اور یکے بعد دیگرے چلے آتے ہیں۔ بعض اوقات ان میں کوئی باہمی تعلق نہیں پایا جاتا اور اکثر اوقات ان میں بہت دور کا تعلق نظر آتا ہے۔ یہ کہیں نہیں بتلایا گیا کہ ایک کم درجہ کا اور دوسرا اعلیٰ درجہ کا فلسفہ ہے۔ دونوں قسم کے عقاید کو تمام کتاب میں اس طرح درج کیا گیا ہے کہ گویا ان میں کسی قسم کا کوئی فرق ہی نہیں۔"

یہی صاحب اپنی بھگوت گیتا کی تمہید میں کہتے ہیں کہ اصل گیتا کا تعلق درحقیقت کرشن بھگتی کے ساتھ ہے جس کا مصنف اس کو شخصیت رکھنے والا خدا مانتا ہے مابعد کے زمانہ میں جب اس کتاب میں ایزادیاں کی گئیں تو اس میں ویدانتی خیالات کے فقرے ایزاد کئے گئے۔ اس نظریہ کے مطابق گیتا کی سات سو آیات میں سے ایک سو سات آیات بعد کے زمانہ میں داخل کی گئیں۔ چنانچہ پروفیسر مذکور کہتا ہے۔ "میں نے اِس سال گیتا کو چھ یا سات دفعہ پڑھا ہے اور میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا ہے کہ اس میں ویدانت اور میمانسا کے حصے اصلی نہیں ہیں۔ جب میں نے ان حصوں کو اصلی گیتا سے جدا کر دیا تو ان کے اخراج سے گیتا کے باقی ماندہ حصوں کے تسلسل میں کوئی فرق دیکھا۔ اس کے برعکس گیتا کے مختلف مقامات میں ان حصوں کے ایزاد ہونے سے جو خرابی تسلسل میں واقع ہو جاتی ہے وہ دور ہو گئی اور اب بحال شدہ مقامات مسلسل طور پر پڑھے جا سکتے ہیں۔ اور ان کے سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر ذیل کے حصوں کو درمیان میں سے خارج کر دیا جائے تو تسلسل قائم رہتا ہے۔

۳: ۹ تا ۱۸ ۶: ۷ تا ۳۲ ۷: ۷ تا ۱۱ ۸: ۲۰ ۹: ۶

معترضین کے اعتراضوں کے جواب میں پروفیسر مذکور کہتے ہیں۔ " یہ حق ہے کہ

گیتا میں اور قدیم اور روحانی زمانوں کے اُپنشدوں کے خیالات کے اظہار اور عبارت میں مشابہت پائی جاتی ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ گیتا ایک قدیم کتاب ہے۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ گیتا کا انحصار اُن خیالات اور فقرات پر ہے جو ایسی کتابوں میں لکھے ہیں جو اس سے بہت زیادہ قدیم ہیں۔ مثلاً ذیل کے گیتا کے مقامات کتھا اُپنشد اور شیوتیش وتر کی آیات سے لفظ بلفظ اخذ کئے گئے ہیں[۱۲]

گیتا ۲:۱۹ = کتھا ۲:۱۹ +	گیتا ۱۱۱۵ = کتھا ۶:۱
" ۲:۲۰ = " ۲:۱۸	" ۱۳:۵ = شیوت ۳:۱۸
" ۲:۲۳ = " ۲:۱۰	" ۱۳:۱۲ و ۱۳:۱۰ = " ۳:۱۶ و ۱۷
" ۸:۱۱ = " ۲:۱۵	" ۸:۹ = شیوت ۳:۸ "

پس گیتا کے مضامین اور عبارت۔ اس کے مذہبی معتقدات اور فلسفیانہ خیالات سب ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کتاب نہ تو کسی ایک شخص کی تصنیف ہے اور نہ کسی ایک زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ اس کا قدیم حصہ غالباً دوسری صدی قبل مسیح لکھا گیا تھا اور بعد کا حصہ مسیح کے بعد دوسری صدی میں لکھا گیا تھا[۱۳]۔

گیتا اور اناجیلِ اربعہ

سطور بالا میں ہم نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ بھگوت گیتا سنِ عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں تالیف کی گئی جب انجیل جلیل کی روشنی مقدس توما رسولِ شہید کی قائم کردہ کلیسیاؤں کی بدولت ہندوستان میں پھیل چکی تھی اور ہندو دھڑا دھڑ مسیحیت کے حلقہ بگوش ہو رہے تھے۔ پس ہندو مذہب کے مفکرین نے مسیحیت کی تعلیم کی روشنی میں اپنے عقائد کی اصلاح کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گیتا پر انجیلی تعلیم کا گہرا اثر نظر آتا ہے چنانچہ ڈاکٹر لارنسر (Lorinser.) نے ۱۸۶۹ء میں یہ نظریہ پیش کیا کہ بھگوت گیتا میں انجیل جلیل کی تعلیم کو ہندی لباس

پہنایا گیا ہے اور مسیحی بیانات کو کرشن پر چسپاں کیا گیا ہے[۴] جسٹس کاشی ناتھ تلنگ نے اس نظریہ کے خلاف دلائل پیش کیں۔ لیکن جیکب صاحب لکھتے ہیں "میری رائے میں یہ دلائل کامیابی کے ساتھ اس نظریہ کو رد نہیں کرتے"[۵] پروفیسر ونڈشش ~Windisch. تک اقبال کرتے ہیں کہ اناجیل اربعہ اور گیتا کے بعض مقامات حیران کن طور پر یکساں ہیں[۶]

ہم ذیل میں گیتا اور اناجیل اربعہ کی چند آیات پیش کرتے ہیں۔ چونکہ ہم طوالت اختیار کرنا نہیں چاہتے لہذا ان مقامات کے اقتباسات دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ناظرین دونوں کتابوں کا مطالعہ کرکے خود دیکھ سکتے ہیں کہ انجیل کی آیات کو بعض اوقات لفظ بلفظ کرشن کے منہ میں ڈالا گیا ہے اور دیگر آیات میں گیتا کی آیات انجیلی آیات کی صدائے بازگشت ہیں۔

انجیل متی ۵: ۴۵ = گیتا ۱۲: ۱۹۔
" ۱۱: ۲۹ = " ۱۸: ۵۰ و ۶۲ و ۶۶
" ۶: ۶ = " ۶: ۱۰
" ۲۸: ۱۸ = " ۹: ۱۰

انجیل مرقس ۲: ۱۰ = گیتا ۱۰: ۳
" ۹: ۲-۸ = گیتا ۱۱: ۱-۱۴
" ۸: ۳۴ = گیتا ۱۸: ۵۷

انجیل لوقا ۱۰: ۲۲ = گیتا ۷: ۲۶
" ۱۸: ۱۸-۲۳ = گیتا ۶: ۱۰
" ۱۱: ۲ = گیتا ۱۱: ۴۴ و زبور ۱۰۳: ۱۳

اناجیل اربعہ میں سے انجیل یوحنا کا بھگوت گیتا پر خاص اثر ہے[۷]۔

چنانچہ ملاحظہ ہو۔

انجیل یوحنا	۱:۳	=	گیتا ۶:۷-۸ و ۹:۳۹ و ۱۰:۳۹
"	۱:۹	=	" ۱۵:۱۲
"	۱:۱۰-۱۱ و ۸:۴۹	=	" ۹:۱۱
"	۳:۱۲	=	" ۹:۳۱
"	۳:۱۷ و ۱۸:۳۶	=	" ۴:۸
"	۵:۱۷	=	" ۳:۲۲
"	۵:۳۹	=	" ۱۵:۱۵
"	۶:۴۵	=	" ۹:۲۵
"	۸:۱۴	=	" ۴:۵
"	۸:۵۱ و ۱۱:۲۶	=	" ۷:۲۹
"	۸:۵۶-۵۸	=	" ۴:۴
"	۱۴:۶	=	" ۹:۱۸
"	۱۴:۲۰	=	" ۹:۲۹
"	۱۴:۲۱	=	" ۴:۱۱ و ۷:۱۷
"	۱۴:۱۷	=	" ۷:۲۵
"	۱۵:۳	=	" ۹:۲۹
"	۱۵:۵	=	" ۱۲:۸
"	۱۵:۲۵	=	" ۱۶:۱۸
"	۱۷:۳	=	" ۱۰:۳

یوحنا کا مکاشفہ ۲۲:۱۳ و ۱:۱۷-۱۸ و ۸ = گیتا ۱۰:۳۲-۳۴

رسولوں کے اعمال ۱۷: ۱۸ = گیتا ۸: ۲۲

یعقوب کا خط ۱: ۱۷ = " ۱۰: ۴۱

ڈاکٹر رادھا کرشن اپنی کتاب انڈین فلاسفی میں گیتا کی چند آیات کا حوالہ دیتے ہیں جن کا مضمون انجیل جلیل کے مضمون کے عین مطابق ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں "گیتا کی یہ تعلیم ہے کہ خدا انسان کا ہر وقت فکر رکھتا ہے" (مقابلہ کرو متی ۶: ۲۵-۳۴) - "گیتا کا مصنف اس بات پر زور دیتا ہے کہ خدا ہر فرد میں بستا ہے۔" (مقابلہ کرو اعمال ۱۷: ۲۸ وغیرہ) "گیتا کے مطابق بھگتی کا یہ مطلب ہے کہ خدا پر ایمان رکھو اور اس کو اپنے سارے دل اور جان سے پیار کرو اور اس میں ہو کر رہو۔" (مرقس ۱۱: ۲۲ و ۱۲: ۳۰ وغیرہ) "حقیقی بھگت خدا کی نسبت فضول بحث کے الجھنوں میں نہیں پڑتا۔" (۲ تمط ۲: ۲۲-۲۴ وغیرہ) "تمام بھگت خدا کے پیارے ہیں لیکن جو بھگت عقل کے ساتھ اس کی پرستش کرتا ہے وہ اُسے سب سے پیارا ہے۔ گیتا ۷: ۱۷" مقابلہ کرو تمثال کی کتاب وغیرہ) "جو حقیقی بھگت ہے وہ روح اور راستی سے اس کی پرستش کرتا ہے۔ گیتا ۱۸: ۵" (یوحنا کی انجیل ۴: ۲۳) "جو اپنے فرائض کو ادا نہیں کرتے اور بیٹھے بیٹھے کرشن۔کرشن۔ کہتے رہتے ہیں وہ پاپی ہیں۔ گیتا ۹: ۳۰۔ دیکھو ایوحنا ۹-۱۱ و ۴: ۱۸-۲۰" (مقابلہ کرو متی ۷: ۲۱) - "جن لوگوں نے گناہ میں جنم لیا ہے یعنی عورتیں۔ شودر۔ ویش اور حرامی - اگر وہ میری طرف رجوع لائیں تو اصل راہ پر آجائیں گے - گیتا ۹: ۳۲" (متی ۲۱: ۳۱-۳۲ و ۹: ۱۰-۱۳ وغیرہ) ڈاکٹر میکنیکل (-Macnicol-) درست کہتے ہیں کہ "اُن لوگوں کا خیال جو گیتا میں انجیلی اثر کو پاتے ہیں اس قسم کی آیت سے تقویت حاصل کرتا ہے جس میں لکھا ہے "جو مجھ سے محبت کرتے

ہیں وہ مجھ میں ہیں اور میں ان میں ہوں" (۹/۲۹) کیونکہ اس آیت کی روح انجیلی ہے جس کا نشان تک ہندو دھرم کی کسی قدیم کتاب میں نہیں ملتا"۔ ۱۹۔ ڈاکٹر رادھا کرشن کی تازہ تصنیف "بھگوت گیتا" کا ایک ایک صفحہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ گیتا کی تمام دلآویز آیات کی روح انجیلی ہے۔

مندرجہ بالا مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ بھگوت گیتا ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں اس قدر مشابہت کا ہونا نہایت معنی خیز ہے۔ اور یہ مشابہت اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اس کتاب کے جو حصے دوسری صدی مسیحی میں لکھے گئے تھے وہ اناجیل اربعہ اور بالخصوص انجیل چہارم کے زیر اثر لکھے گئے تھے۔ گیتا کی مرکزی تعلیم ہی یہ ہے کہ خدا شخصیت رکھنے والا اور نجات دینے والا خدا ہے اور اسی تعلیم کی وجہ سے وہ ہر زمانہ میں مقبول خلائق رہی ہے۔

کرشن کی پیدائش کی رسوم

ڈاکٹر آر۔ جی۔ بھنڈارکر کہتے ہیں۔ "پہلی صدی مسیحی میں ابھیرس قوم کے خانہ بدوش گوالوں کے مالک دیوتا کرشن کو واسدیو کے ساتھ یکساں کر دیا گیا۔ یہ خانہ بدوش قوم ملک شام یا ایشیائے کوچک سے مشرق کی جانب آئی اور اپنے ساتھ مسیح کے اصطبل میں پیدا ہونے اور معصوم بچوں کے قتل عام کی کہانیاں لے آئی۔ ان کے علاوہ وہ کرائسٹ (مسیح) کا نام بھی اپنے ہمراہ لے آئے کیونکہ یہ نام اور کرشن کا نام درحقیقت ایک ہی نام ہے۔ کیونکہ ہندوستانی کرائسٹ کو کرشٹ یا کرسٹ کہتے ہیں۔ اور یوں یہ روایات جو ابھیرس قوم کے گوالے اپنے ساتھ لے آئے تھے ہندوستان کے واسدیو کرشن کی روایات کا حصہ بن گئیں"۔ ۲۰

ہندو دھرم کے بعض علماء ڈاکٹر صاحب موصوف کے نظریہ کے ساتھ متفق ہیں۔

متعدد علماء کے نزدیک چھٹی صدی مسیحی میں کرشن مت میں بڑی زبردست تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس زمانہ کی جو روایات کرشن کے متعلق ہیں وہ سب کی سب مسیحیت کی مرہونِ منت ہیں کیونکہ ان کا سرچشمہ اور ماخذ مسیحی عقائد۔ رسوم اور قصص ہیں۔

چھٹی صدی مسیحی تک کرشن محض ایک جنگجو سورما اور گیتا کے خیالات کی تعلیم دینے والا ہی مانا جاتا تھا لیکن ابھی تک وہ الوہیت کی صفات سے متصف نہیں ہوا تھا لیکن اب کرشن کو پورن دیوتا قرار دے دیا گیا اور اس کو وشنو کا اوتار مان کر اس کی پرستش ہونے لگی اب سے عوام الناس اس بالک دیوتا کی پوجا کرنے لگ گئے۔

پروفیسر ویبر[۳۱] (-Weber.) جیسے عالم کا خیال ہے کہ کرشن کی پوجا کا تعلق مسیحیت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے "کرشن کی بطور ایک واحد خدا کے پوجا کرنے کا خیال ہندو دھرم کے آخری دور کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ وراہمی ہیرا میں اس خیال کا نشان تک نہیں ملتا۔ وہاں کرشن کا محض سرسری طور پر ضمنی ذکر آتا ہے۔ علاوہ ازیں اس قسم کی پوجا کا اُس سے پہلے کے برہمنی قصص سے کوئی معقول تعلق نظر نہیں آتا۔ دونوں کے درمیان ایک ایسا خلا پایا جاتا ہے جس کا سوائے اس کے اور کوئی سبب دکھائی نہیں دیتا، کہ اس زمانہ میں بیرونی حالات ہی ایسے پیدا ہو گئے تھے جن کی وجہ سے کرشن کا بطور ایک واحد خدا کے پوجا جانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ یہ حالات مسیحیت کی آمد اور اشاعت سے تعلق رکھتے تھے"

وشنو پران میں لکھا ہے کہ کرشن کا رضاعی باپ نند اپنی حاملہ بیوی کو کرشن کی پیدائش کے وقت متھرا لے گیا تاکہ ٹیکس ادا کرے جب کرشن پیدا ہوا تو کنس راجہ نے معصوم بچوں کا قتل عام کر دیا۔ وغیرہ

کرشن کی پیدائش کے کتابی بیان اور کرشن کے تہوار کی رسوم کے درمیان

زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس تہوار کے روز جو رسوم منائی جاتی ہیں اُن کا کرشن کی پیدائش کے بیانات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ خداوند یسوع مسیح کی ولادت کی رسوم و روایات کی نقل ہیں۔ اس بیان میں اور آنخداوند کی پیدائش کے حالات میں صرف یہی ایک مشابہت پائی جاتی ہے کہ بچہ کو جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے اور باپ بچہ کو ساتھ لے کر جمنا پار بھاگ جاتا ہے۔ لیکن یہاں دونوں کی باہمی مشابہت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن جو رسوم کرشن کی پیدائش کے وقت ادا کی جاتی ہیں اُن میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ ان رسوم میں باپ بچہ کو لے کر رُوپوش نہیں ہوتا بلکہ ماں بچے کی پیدائش سے پہلے ایک گوسالہ میں جاتی ہے، بچہ گوسالہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کہانی کی تصویروں میں ہم کو یہ دکھایا جاتا ہے کہ ماں بڑی شانتی سے کے ساتھ سو رہی ہے۔ بچہ اس کی چھاتی سے لگ کر دودھ پی رہا ہے۔ ماں اور بچے کے چاروں طرف گوالے۔ گوالینیں اور گوپیاں کھڑی تعریف و ستائش کے گیت گاتی ہیں۔ ماں کی ایک طرف گدھا اور بیل بندھے ہوتے ہیں۔ آسمان پر ایک ستارہ دکھایا جاتا ہے جو نجات کا پیش رَو ہے۔ یہ رسوم اور تصاویر ہم کو بیت اللحم کی چرنی، ہیرودیس کے غضب، گڈریوں کے تعریف و ستائش کے گیتوں اور مجوسیوں کے ستارہ وغیرہ کی یاد دلاتی ہیں۔ مسیحی رسوم کی نقل اس امر سے بھی عیاں ہے کہ ان تصاویر میں کرشن اور اس کی ماں دونوں کے سروں کے گرد ہالا یا منڈل بھی ہوتا ہے جس طرح خداوند مسیح اور بی بی مریم کے سروں کے گرد مسیحی تصاویر میں دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ بات خاص طور پر عجیب اور قابلِ ذکر ہے کیونکہ ہندوستان میں سوائے دُرگا کے کسی عورت کی پرستش نہیں کی جاتی۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ ہندو دھرم نے نہ صرف انجیلی بیانات کو اپنا لیا بلکہ کلیسیا کے اُن دستورات اور رسوم کو بھی اختیار کر کے ان کو ہندی جامہ پہنا دیا ہے چنانچہ پروفیسر ویبر (—Weber.

کہتے ہیں: "کرشن کی پیدائش کے قصص۔ اس کے جنم دن کی رسومات۔ اس کی ماں دیوکی کی کہانیاں وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو اصلی روایات سے کوسوں دور ہیں۔ ان کا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے کہ مسیحی روایات، بیانات اور رسومات نے ان پر اپنا اثر ڈالا ہے اور ہندوؤں نے ان مسیحی کہانیوں کو اپنے خیالات کے مطابق ڈھال لیا ہے۔" ۲۲ھ

کرشن کے معجزات

کرشن کے معجزات میں بھی ہم کو اناجیل اربعہ کے معجزات کی جھلک نظر آتی ہے۔ چنانچہ کرشن کے معجزات میں ایک عورت کے مردہ بیٹے کو زندہ کر دینے کی کہانی اور ایک لنگڑے کو چلنے پھرنے کی طاقت دینے کی کہانی بھی موجود ہے۔ کرشن کے سر پر عورتوں کا روغن ملنے کا بھی ذکر موجود ہے۔ ڈاکٹر کینیڈی (Kennedy) کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام کہانیاں اُن انجیلی واقعات کو ہندی لباس میں پیش کرتی ہیں جو شمال مغرب کے گوجر نقل مکانی کر کے گنگا کے دوآبہ میں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ۲۳ھ

فصل دوم

مسیحیت کی آمد اور بھگتی مارگ

بھگتی مارگ کا تعلق انسان کی جذباتی زندگی کے ساتھ ہے۔ اس مارگ میں خدا کے ساتھ محبت کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ پس یہ مارگ گیان مارگ اور کرم مارگ سے الگ ہے۔ اس مارگ کے مطابق خدا شخصیت رکھتا ہے۔

جس میں آنند اور خوبصورتی پائی جاتی ہے اور محبت کے ذریعہ اس ہستی تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔

بھگتی کی قدامت

مہابھارت کا اہم ترین مذہبی عقیدہ واسدیو کرشن مت ہے جو بھگوت گیتا اور موجودہ وشنو مت کی بنیاد ہے۔ پروفیسر گارب (-Garbe.) کے خیال میں بھاگوت مت چار مختلف دوروں میں سے ہو کر گذرا ہے۔ پہلے دور میں اس کا برہمن مت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ یہ دور مسیح سے تین سو سال پہلے تک رہا۔ اس زمانہ میں کرشن واسدیو نے توحیدی مذہب شروع کیا جس کے ساتھ سانکھیہ یوگ فلسفہ وابستہ تھا۔ اسی زمانہ میں اس مت کے بانی کی پوجا شروع ہو گئی اور مذہبی جذبات کی بنا بھگتی خیالات پر قائم تھی۔ دوسرے دور میں اس مت پر براہمنی رنگ چڑھنا شروع ہو گیا۔ کرشن کو وشنو کے ساتھ سہیوگ کر دیا گیا اور وشنو کو سب سے بڑا دیوتا قرار دے دیا گیا۔ یہ دور تقریباً مسیح کی آمد تک رہا۔ تیسرے دور میں بھاگوت مت وشنو مت ہو گیا۔ اور ویدانتی خیالات سانکھیہ یوگ فلسفہ کے ساتھ شامل کر دیئے گئے۔ یہ دور ۱۲۰۰ء تک رہا۔ اس کے بعد چوتھا دور فلاسفر رامانج کا ہے جس نے اس مت کو فلسفیانہ شکل دے دی۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کرشن کس طرح واسدیو اور نارائن ہو گیا۔؟ مہابھارت میں کرشن میں اور ان دونوں میں تمیز کی گئی ہے۔ میگستھنیز (-Megasthenes.) جو ۳۰۰ ق۔م۔ میں چندر گپت کے دربار میں سفیر تھا کہتا ہے کہ اس زمانہ میں متھرا میں کرشن کی پوجا ہوتی تھی۔ ڈاکٹر بھنڈارکر کا خیال ہم گذشتہ فصل میں بیان کر آئے ہیں کہ ایک خانہ بدوش قوم ابھیرس ایک ایسے دیوتا کی پرستش کرتی تھی جو بالک تھا۔ یہ قوم غیر مہذب

تھی اور آریہ نسل کی نہ تھی۔ مہابھارت میں کرشن کے متعلق ہر قسم کی روایات پائی جاتی ہیں جو اس وقت مروج تھیں۔ وہ ایک غیر آریہ نسل کا سورما ہے اور ایک حانی استاد اور قوم کا دیوتا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشن کہتے ہیں۔[۳۵] "یہ ظاہر ہے کہ مہابھارت کے ترتیب دینے والے جامع کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کسی مقبول عام سورما کو مذہب میں مرکزی جگہ دے تاکہ آزاد خیالی کے عاشقوں کے زبردست اقتدار کا قلع قمع کر سکے۔ مہابھارت کو مرتب کرنے والوں نے اس غرض کے لئے کرشن کو لے لیا جس کے کارناموں نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا تھا۔ لیکن وہ در حقیقت ایک غیر آریہ نسل کا دیوتا تھا اور اگر آج کرشن ہندو دیوتاؤں میں مقبول ترین ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بھگوت گیتا نے اس کو ایک اعلیٰ فلسفہ کا استاد اور ہندو دھرم کے اصول کی تشریح کرنے والا بنا دیا ہے۔"

پس بھاگوت مت مسیحیت کی آمد سے پہلے ہندوستان میں پایا جاتا تھا۔ آثار قدیمہ کی شہادت بھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ بھاگوت مت ہندوستان میں مسیحیت سے قبل موجود تھا۔[۳۶] لیکن گو بھگتی خیالات کی داغ بیل ہمارے وطن میں ہی پڑی پر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا بھاگوت مت بت پرست برہمنوں کے اقتدار میں آتا گیا۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ بھگتی مارگ کا اصلی مقصد فوت ہو گیا۔ بھگوت گیتا کے مطالعہ بھی یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ بھگتی کا طریق یوگ فلسفہ کا ردِ عمل تھا اور لوگ اس کی سختی اور درشتی کے ہاتھوں تنگ آ گئے تھے۔ یوگ میں انسانی خواہشات اور جذبات کو دبانے کی تلقین کی گئی ہے لیکن فطرتِ انسانی ایسی تعلیم سے بغاوت کرتی ہے۔

بھگتی مارگ کا احیاء اور مسیحیت کی آمد

پہلی صدی مسیحی میں مقدس توما رسولِ شہید کی قائم کردہ

کلیساؤں نے ہندوستان میں ہر جگہ انجیل جلیل کے عقائد کا پرچار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ مسیحیت کا بول بالا ہو گیا۔ روشن خیال ہندو پہلے ہی بت پرستی اور یوگ کے فلسفہ کی تعلیم سے تنگ آئے بیٹھے تھے پس ہندوستان کی زمین مسیحیت کے خیالات کے لئے تیار تھی اور لوگ جوق در جوق خداوند مسیح کے حلقہ بگوش ہونے لگے۔ پس ہندو دھرم کے کرتا دھرتا لوگوں نے قدیم بھاگوت مت کو از سر نو تازہ کیا۔ انجیل جلیل کی تعلیم عوام کے دلوں کو موہ رہی تھی۔ کیونکہ اس کے مطابق خدا ایک ایسی ہستی ہے جو کل بنی نوع انسان کا باپ ہے اور ہر گنہگار سے ابدی محبت کرتا ہے۔ اس نے دنیا میں جنم لے کر بدی اور موت کو نیست و نابود کر دیا تاکہ ہر گنہگار ان کے پنجہ سے رہائی پائے۔ یہ تعلیم ہر پاپی کے لئے ایک خوشی کی خبر تھی جو ہر ہندو کو جنم اور کرم کے چکر سے آزاد کر رہی تھی۔ پس گیتا میں ایسے عناصر کو داخل کر دیا گیا جو مسیحیت کے عقائد کے مشابہ تھے اور ہندو مذہب نے بھگتی کے پرانے خیالات کو نشوونما دی تاکہ وہ نئی زندگی حاصل کر کے انجیلی خیالات کا مقابلہ کر سکے۔ بھگتی مارگ کی ساخت میں انجیلی خیالات و عقائد کی تار و پود موجود ہے۔ چنانچہ جیکب کہتا ہے "ہندو دھرم کے اُفق پر بھگتی خیالات کا اچانک نمودار ہو جانا ایک ایسی حقیقت ہے جس کی وجہ معلوم کرنا لازم ہے۔ ہمیں یہ بات چار و ناچار ماننی پڑتی ہے کہ مسیحیت کی آمد کی وجہ ہی سے یہ واقعہ رونما ہوا۔ اگر ہم اس کا انکار کر دیں تو اس حقیقت کی تشریح اور توضیح ناممکن ہو جاتی ہے" [۲۷]

فصلِ سوم

مسیحیت کے اصول اور بھگتی کا فلسفہ

گذشتہ فصل میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بھاگوت مت کا چوتھا دور رامانج سے شروع ہوا جس نے اس مت کو فلسفیانہ صورت دیدی۔ اس فلاسفر کے خیالات اور معتقدات سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ ہم شنکر آچاریہ کے فلسفہ کے اصولوں سے واقف ہوں جن کی رامانج نے تردید کی اور یوں اس نے بھاگوت مت کو فلسفیانہ لباس پہنا کر ہندو دھرم میں ایک مستقل جگہ دے دی اور بھگتی مارگ میں نئی زندگی کا دم پھونک دیا۔

شنکر آچاریہ کے فلسفہ کے اصول

ہم اس رسالہ کے بابِ ششم کی تیسری فصل میں ذکر کر چکے ہیں کہ جب نوویں صدی کے شروع میں ہندو دھرم کا مشہور مصلح شنکر آچاریہ مالابار میں تھا تو اس کے فلسفیانہ خیالات کی رو کی وجہ سے متعدد مسیحی مرتد ہوگئے تھے۔ وہ ایک نمبودری برہمن تھا جو ہندو مذہب کے قابل ترین مفکروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے ویدانت (یعنی وید کے آخری حصہ) کی جو شرح لکھی ہے، وہ آج بھی عام طور پر ہندو فلسفہ کے مترادف خیال کی جاتی ہے۔ اس نے یہ شرح محض ذہنی شغل اور اپنی فلسفیانہ لیاقت بگھارنے کے لئے نہیں لکھی تھی بلکہ اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ ویدانت کی شرح کے ذریعہ وہ ہندو دھرم

کے بنیادی خیالات اور معتقدات کی اصلاح کر کے اس مذہب کو پائدار بنا دے۔
اس کے ادوائیت فلسفہ کے اصول حسب ذیل ہیں:۔

حقیقی ہستی صرف ایک ہی ہے جو واجب الوجود۔ ازلی اور ابدی ہے۔ اس کا نام برہم ہے۔ اس ہستی کے علاوہ کسی شے کا حقیقی وجود نہیں ہے۔ اس دنیا میں جو کثرت ہم کو نظر آتی ہے وہ دراصل نہ تو کوئی ہستی رکھتی ہے اور نہ فی الحقیقت اس کا کوئی وجود ہے۔ یہ کثرت محض مایا ہے جو دھوکا اور سراب کی طرح ہے اور ہم کو اس لئے نظر آتی ہے کیونکہ ہم اودیا اور جہالت میں پھنس کر اصلی راہ کو کھو بیٹھے ہیں، اور آواگون کے چکر میں مبتلا ہیں۔ اس حالت سے نجات حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم کو اس بات کا پورا اور کامل گیان ہو جائے کہ کثرت فی الحقیقت محض مایا ہے کیونکہ صرف برہم ہی ایک ازلی ابدی اور لاتبدیل ہستی ہے اور ہماری آتما ہی وہ برہم ہے (تت توم اسی) جب ہم کو یہ گیان حاصل ہو جاتا ہے تو اودیا کا پردہ پھٹ جاتا ہے۔ آواگون کا چکر ختم ہو جاتا ہے اور اس چکر سے آزاد ہو کر ہم کامل آنند اور راحت اور شانتی حاصل کر لیتے ہیں۔

یہ واجب الوجود حقیقی ہستی (یعنی برہم) کوئی صفت نہیں رکھتی۔ اس میں نہ تو کوئی شخصیت ہے اور نہ وہ کسی قسم کی شخصیت کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ چونکہ انسانی آتما خود برہم ہے پس اس کا برہم کے ساتھ تعلق رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ پس انسانی روح خدا کے ساتھ عبودیت۔ محبت۔ بھگتی وغیرہ کی طرح کا کوئی رشتہ یا تعلق نہیں رکھ سکتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ لفظ "تعلق" کا یہاں اطلاق ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ "تعلق" صرف دو مختلف چیزوں کے درمیان ہی ہو سکتا ہے لیکن آتما اور برہم دو نہیں بلکہ درحقیقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

شنکر آچاریہ کے ان فلسفیانہ خیالات سے انسانی روح کو قلبی تسکین نہیں ملتی۔ انسان کی روح ایک ایسے معبود کی تلاش کرتی ہے اور فطرتِ انسانی ایک ایسے خدا کو ماننے کا تقاضا کرتی ہے جس کے ساتھ وہ شخصی تعلقات رکھ سکے، جس کی وہ عبادت کر سکے جس پر وہ اپنا سارا آسرا رکھ سکے، جس کے ساتھ محبت کر سکے اور کامل طور پر اطاعت کر کے آرامِ جان اور شانتی حاصل کر سکے۔ پس اگرچہ ہندو دھرم کے فلاسفر اور پنڈت اس ادوائیت فلسفہ کا پرچار کر کے گم گشتہ روح کو گیان کے ذریعہ نجات کا راستہ دکھلاتے رہے تاہم عوام کی روحوں کی پیاس مجرد فلسفیانہ تصورات کے شراب سے نہیں بجھ سکتی۔ اور بھوکی روحیں خشک خیالات کی بھوسی سے سیر نہیں ہو سکتیں۔ ادوائت فلسفے کے پرچارکوں کو اس بات کا اقبال ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اگر عامۃ الناس شیو۔ گنیش۔ ہری۔ درگا وغیرہ کو ایشور سمجھ کر ان کو پوجنے کی خواہش رکھتے ہیں تو یہ فطری تقاضا ان کی اَوِدیا اور جہالت کا نشان ہے اور ثابت کرتا ہے کہ وہ ابھی مایا اور اَوِدیا کی دنیا میں رہتے ہیں لیکن فلاسفر ایسے خیالات سے بلند و بالا ہیں اور گیان ہی کے ذریعہ مکتی حاصل کرتے ہیں۔

ان فلسفیانہ خیالات کے برعکس جنوبی ہند میں مسیحیت عوام کو ایک ایسے خدا کی جانب بلاتی تھی جس کی ذات محبت ہے، وہ باپ ہے جو انسان سے اس قدر محبت رکھتا ہے کہ وہ بے قرار اور بے چین رہتا ہے جب تک اس کا گنہگار بیٹا اپنے گناہوں سے تائب ہو کر اس کی گود میں واپس نہ آجائے۔ انجیل جلیل ہندوؤں کو یہ بتلاتی تھی کہ خدا کی محبت گنہگار انسان کی تلاش کرتی رہتی ہے اور ہمیشہ چاہتی ہے کہ وہ ہر گنہگار کو محض اپنے فضل کے ذریعہ گناہوں سے نجات دے۔ انجیل کے پرچارک ادوائت فلسفہ کی عین ضد یہ سکھلاتے تھے کہ گناہ اَوِدیا اور جہالت کا نام نہیں اور نہ نجات گیان کے وسیلہ ہو سکتی ہے۔ اور کہ مکتی اواگون کے چکر سے رہائی حاصل کرنے کا

نام نہیں بلکہ خدا کے ساتھ رفاقت رکھنے کو نجات کہتے ہیں۔ کامل اندراس گیان سے حاصل نہیں ہوتا کہ آتما اور برہم درحقیقت ایک ہی ہستی ہے بلکہ خدا سے وصال حاصل کرنے سے حقیقی اطمینان ملتا ہے۔ پس عوام الناس اپنے فطرتی تقاضاؤں سے مجبور ہو کر مسیحیت کی جانب راغب ہوتے جاتے تھے۔ وہ نہ تو ان فلسفیانہ خیالات کے سمجھنے کے اہل تھے اور نہ مجرد تصورات ان کی روحوں کی بھوک اور پیاس کو مٹا کر ان کو قلبی تسکین دے سکتے تھے۔ پس شنکر آچاریہ کے فلسفہ کے خلاف جنوبی ہند کے ہندو مصلحین نے یکے بعد دیگرے صدائے احتجاج بلند کی۔ یہ مصلحین نہ صرف عالم تھے بلکہ بے مثل شاعر بھی تھے۔ ہندو گویوں نے جا بجا اُن کے اشعار اور غزلات کو گا کر تامل بولنے والے عام ہندوؤں میں ان کے اصلاحی خیالوں کا پرچار کر دیا۔ اُن میں سب سے زیادہ مشہور یامن تھا جو نہ صرف ایک جید عالم تھا بلکہ خوش گو شاعر اور خوش گلو گویا بھی تھا۔

پس اگرچہ (جیسا ہم اوپر کہہ چکے ہیں) بھگتی کے خیالات نے ہمارے ملک میں خداوند مسیح سے کئی صدیاں پہلے جنم لیا تھا لیکن جب گیارہویں صدی میں مسیحیت کی اشاعت ہندوستان کے طول و عرض میں ہو گئی تو ہندو فلاسفہ اور مفکروں نے ویدانت کے جمود سے نکلنے کے لئے اور ہندو عوام کو مسیحی عالمین کے قدموں میں آنے سے روکنے کے لئے بھگتی مرت کی یاد کو دوبارہ تازہ کر دیا۔ چنانچہ ایک ہندو مصنف لکھتا ہے[۲۸]

"گیارھویں صدی مسیحی میں جنوبی ہند کی مذہبی دنیا میں سخت اُلجھن مچ گئی۔ ہندو مذہب اپنے عقائد کی تصحیح اور اصلاح کر کے ایسا منظم ہو جانا چاہتا تھا کہ وہ دوسرے فرقوں اور مذہبوں کے سامنے نہ صرف قائم رہ سکے بلکہ سماج پر غالب آسکے۔ چنانچہ رامانج عین وقت پر پیدا ہوا۔"

رامانج کا فلسفہ

شنکر آچاریہ کے قریباً تین صدیوں کے بعد اس کے فلسفیانہ خیالات کا سب سے بڑا مخالف رامانج اٹھا۔ یہ شخص ۱۰۵۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۱۳۷ء میں فوت ہو گیا اُس کا نام لکشمن رکھا گیا لیکن بعد میں وہ رامانج کے نام سے (اور تامل میں ایلیہ پیرومال ؒ کے نام سے) مشہور ہوا۔ وہ ایک نہایت قابل مفکر اور زبردست فلاسفر تھا۔ اس نے جو شرح ویدانت سوتر کی لکھی ہے وہ شنکر آچاریہ کی شرح کے عین ضد ہے۔ اس کے سدھانتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شنکر آچاریہ کو ہندو دھرم کے ویدوں کا جانی دشمن اور بدترین بدعت کا بانی سمجھتا تھا۔

ادویت فلسفہ کی عین ضد میں وہ کہتا ہے کہ دنیا اور مافیہا کا وجود حقیقی ہے۔ ہمارے احساسات ہم کو اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ کثرت مایا نہیں ہے بلکہ حقیقی وجود رکھتی ہے۔ انسانی شعور ثابت کرتا ہے کہ جب ہم کسی شے کا علم رکھتے ہیں تو علم رکھنے والا اور معلوم شے دونوں کا حقیقی وجود ہوتا ہے۔ نجات نروان سے حاصل نہیں ہوتی۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے:-

"اگر کوئی شخص کسی کو جو نجات حاصل کرنا چاہتا ہے یہ کہے کہ جب تو نجات حاصل کرے گا تب تو نہیں رہے گا اور تیری روح فنا ہو جائے گی۔ تو وہ یہی جواب دے گا کہ نہ بابا، میں ایسی نجات سے باز آیا اور وہ اس قسم کی نجات کو دور ہی سے سلام کر کے چل دے گا حالانکہ وہ نجات کا طالب ہے۔ کیونکہ لفظ نجات بے معنی رہ جاتا ہے۔"

رامانج نے ذیل کے اصول قائم کر کے مسیحیت کی روشنی میں ہندو فلسفیانہ خیالات کی اصلاح کی:-

(۱) برہم اعلیٰ ترین حقیقی واجب الوجود واحد ہستی ہے۔ وحدت کا یہ مطلب

نہیں کہ اس کے علاوہ دنیا اور مافیہا کا وجود ہی نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور اس واحد خدا کا کوئی شریک نہیں۔ یہ برہم ازلی اناؔدی الیشور ہے جو شخصی صفات رکھتا ہے یعنی اس کو اپنا علم ہے اور اس نے خود اپنے ارادہ اور مرضی سے اس دنیا کو خلق کیا ہے۔ جو مایا نہیں ہے بلکہ حقیقی وجود رکھتی ہے۔

(۲) الیشور یعنی خدا اپنی مخلوق کو نجات بخشتا ہے۔ وہ اپنے فضل و رحم کی وجہ سے اس دنیا میں وقتاً فوقتاً جنم لیتا ہے تاکہ دنیا کو گناہ سے بچائے اور اپنے پرستاروں کو دکھ اور مصیبت سے چھڑائے۔ اس کے تیئیس اوتاروں میں سے دو اوتار سب سے بزرگ ہیں یعنی رام چندر اور کرشن۔ چوبیسواں اوتار آنے والا ہے۔

(۳) خدا روح ہے اور اعلیٰ ترین صفات کا مالک ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اور تمام دیوتاؤں اور معبودوں کا خالق ہے۔ جن ہستیوں کو ویدوں میں دیوتا کہا گیا ہے وہ اس کے خادم ہیں جو اس نے خلق کئے گئے ہیں تاکہ دنیا کا انتظام چلائیں۔

(۴) یہ سچ ہے کہ ہندو شلوکوں میں "تت توَم اسی" لکھا ہے لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ برہم اور آتما میں کوئی فرق اور دوئی نہیں۔ بلکہ برہم کا آتما کے ساتھ وہی تعلق ہے۔ جو انسان کی روح کا اس کے جسم کے ساتھ ہے۔ ہر انسان اپنے جسم کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔ کہ "میں نے یہ کیا" لیکن روح اور جسم

ع رامانج لفظ الیشور کو بالکل انہی معنوں میں استعمال کرتا ہے جو انجیل میں لفظ خداوند کے لئے مخصوص ہیں جو مسیح کے لئے ہے۔ E.R.E.ii, 550

ایک شے نہیں بلکہ دو ہیں جس طرح انسانی روح انسان کے جسم میں کارفرما ہے، اُسی طرح خدا انسانی روح میں کارفرما ہے۔ دنیا اور مافیہا گویا خدا کا جسم ہے جس کی روح الشعور ہے لیکن لاشعور اور دنیا' خالق اور مخلوق' ایک نہیں ہیں بلکہ دونوں میں فرق اور امتیاز ہے۔ خدا انسانی روح میں نہانی طور پر رہتا ہے اگرچہ انسانی روح اس رمز کو ایک مدت تک نہیں جانتی۔ یہ علم اس کو صرف تب ہوتا ہے جب وہ مکتی حاصل کر لیتی ہے۔ یہ تعلق صرف باہمی یگانگت کا رشتہ ہے لیکن اس سے دونوں کی یکتائی ثابت نہیں ہوتی۔

(۵) رامانج کہتا ہے کہ ہم صرف بھگتی کے ذریعہ گناہ سے نجات پا کر پاکیزگی حاصل کر سکتے ہیں۔ بھگتی ایمان کا نام ہے اور خدا سے محبت رکھنے کے مترادف ہے خدا محبت ہے کیونکہ وہ ہماری نالائقیوں کے باوجود ہم سے پیار کرتا ہے اور ہر طرح کی نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ پس لازم ہے کہ ہم کامل طور پر اپنے آپ کو اس کے سامنے ارپن کر دیں اور اس کے مطیع بن جائیں۔ اس کو پرپتی یا شرنگتی کا عقیدہ کہتے ہیں۔ اور یہ بھگتی کا لازمی نتیجہ ہے۔ پرپتی کے عقیدہ کی بنیاد یہ ہے کہ خدا پر پورا انحصار رکھنے کا کامل احساس ہو۔ یہ بھروسا بے چون و چرا ہو اور اتم درجہ کا ہو۔ رامانج کی مشہور دعا "شرنگتی گدیہ" اس ایمان اور بھروسہ کی مثال ہے جس میں ایمان ایسے خدا پر ہے جو اس کی واحد پناہ گاہ اور اس کا نجات دینے والا ہے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر کہتے ہیں کہ پرپتی کے بہترین نکات مسیحیت سے اخذ کئے گئے ہیں۔ (ولشنومت صفحہ ۵)

جس شخص نے انجیل جلیل کا سطحی مطالعہ بھی کیا ہے وہ فوراً بھانپ گیا ہوگا کہ رامانج کے اصول اصلاح انجیلی فضا کا نتیجہ ہیں۔ رامانج مائلا پور کا رہنے والا تھا جہاں مقدس توما رسولِ شہید کا مزار تھا اور جہاں مسیحی راہب خادمانِ دین اور

بشپ صدیوں سے رہتے اور انجیل جلیل کا پرچار کرتے چلے آئے تھے۔ اسی جگہ اس کے
خیالات ویدانت کی طرف سے بیزار ہو کر بھگتی کی جانب راغب ہوئے اور اسی جگہ اس
نے اپنے خیالات کو فلسفیانہ شکل بھی دی۔ اسی جگہ اس کو ان خیالات کی وجہ سے
ایذائیں بھی اٹھانی پڑیں حتیٰ کہ اس کو تنجور م سے ہجرت کرنا پڑی۔ اس نقل مکانی کی
وجہ سے اس کے فرقے سمپردائے کو جا بجا مقبولیت حاصل ہوتی گئی۔ اس نے
رام کی جن صفات پر زور دیا ہے اُن سے مسیحیت کا اثر ظاہر ہے۔ چنانچہ رام کو محبت
کا خدا بتلایا گیا ہے۔ جو دنیا کو اس طرح پیار کرتا ہے جس طرح باپ بیٹے سے محبت
رکھتا ہے۔ راما نج اور یامن وغیرہ کو تین صدیوں کے تجربے نے یہ سکھلا دیا تھا کہ جس پیرایہ
میں شنکر آچاریہ کے فلسفے نے مکتی کے تصور کو پیش کیا ہے وہ عوام کے دلوں کو مسخر
نہیں کر سکتا۔ دوئیت کے اصول اور مایا کی تعلیم ان کے دلوں کی تشفی نہیں کر سکتی تھی
اور ان کی روحیں شانتی اور نجات حاصل کرنے کے لئے بے چین اور بیقرار تھیں۔ پس
راما نج نے خدا کی شخصی صفات اور خدا اور انسان کے باہمی تعلق کی تعلیم دی اور عوام کو
بتلایا کہ مکتی خدا کے ساتھ تعلق پیدا کرنے ہی سے مل سکتی ہے اور یہ تعلق ایمان کے
ذریعہ اور محض خدا کے فضل کے وسیلے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے جس کا انحصار ہمارے
اپنے اعمال پر نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ خدا کے فضل کے ذریعہ ایماندار ایشور
کے پاس آنند کی حالت میں رہتے ہیں۔ راما نج نے یہ سب باتیں انجیل سے حاصل
کیں چنانچہ ڈاکٹر گرائرسن (—Grierson.) جو دور حاضرہ کے
مستشرقین میں نہایت بلند پایہ رکھتے ہیں اور بھگتی مارگ پر ایک مستند مصنف
مانے جاتے ہیں) کہتے ہیں "جنوبی ہند میں مسیحیت نے مذہبی دنیا پر بڑا اثر کیا۔ اگرچہ
ہم کو ہندوستان میں خدا کے باپ ہونے کا تصور اور بھگتی کا تصور دونوں ملتے
ہیں لیکن مسیحیت کی آمد سے انجیلی عقائد نے اس تعلیم کو بہت تقویت دیدی۔ یہ اثر

جنوبی ہند کے مسلمین پر نمایاں طور پر ظاہر ہے۔ اس خمیر کی وجہ سے ان کی تعلیم تمام
ہندوستان میں پھیل گئی جس نے ہند کے لوگوں کو جو اغیار کے حملوں سے ہراساں
اور پریشان ہو رہے تھے، دلاسا دیا۔ اس میں رتی بھر مبالغہ نہیں کہ اس اصلاح کے ذریعہ
ہندوستان نے ایمان اور محبت کو از سر نو حاصل کیا۔"

رامانج کے وشنو مت کو شری سمپردائے کا نام دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس
میں شری یعنی لکشمی دیوی کو ایسا رتبہ حاصل ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں۔ اس نے
شیو کے بہت مندروں کو وشنو کے مندروں میں تبدیل کر دیا کیونکہ وہ وشنو اور
لکشمی کی پوجا کرتا تھا۔ زمانہ حال کے شری ویشنووں میں اکثر تین فرق پائے جاتے
ہیں جن میں سے بعض مذکر اور بعض مؤنث اور بعض دونوں کی جفتی صورت کی پوجا
کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض نارائن کی اور بعض لکشمی کی اور بعض لکشمی نرائن کی پوجا کرتے ہیں،
بعض رام کی اور بعض سیتا کی اور بعض سیتا رام کی پوجا کرتے ہیں۔ بعض کرشن
کی اور بعض رکمنی کی اور بعض رکمنی کرشن کی پوجا کرتے ہیں۔

رامانج کا یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص بھگتی کے ذریعہ مکتی حاصل کرنا چاہتا
ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ گنہگار ہے لیکن خدا ایک عادل منصف ہے اور
ساتھ ہی رحیم و کریم بھی ہے جو ہمارے گناہ بخش دیتا ہے۔ پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے
کہ اگر وہ عادل منصف ہے تو وہ کس طرح گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔ رامانج کا جواب
یہ ہے کہ لکشمی مائی جو خلقت کی ماں ہے درمیانی ہو کر ہمارے لئے خدا سے سفارش
کرتی ہے۔ یہ دیوی وشنو کی بیوی ہے اور محبت اور پیار سے معمور ہے پس وہ
عادل خدا اور گنہگار انسان کے درمیان کامیابی سے درمیانی کا پارٹ ادا کرتی
ہے۔ خدا کا انصاف اس بات کا خواہاں ہے کہ سزا دے لیکن لکشمی رحیم ہے جو سزا دینا
جانتی ہی نہیں۔ وہ شفیع ہے اور خدا کی ذات میں سے ہے جب اس کا پرستار اس سے

دعا کرتا ہے تو وہ شفاعت کا کام سرانجام دیتی ہے۔ پس خدا کا فضل ڈھونڈنے سے پہلے لازم ہے کہ لکشمی کا رحم حاصل کیا جائے جس سے نئے اور پرانے گناہ سب معاف ہو جاتے ہیں اور ہماری رسائی خدا تک ہو جاتی ہے۔ تمام گنہگار ربانی لکشمی کے بچے ہیں پس کوئی گنہ گار اس کی سفارش سے مستثنےٰ نہیں ہے۔ خدا کی محبت تمام بنی آدم پر حاوی ہے۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ رامانج نے مسیحی خیالات کو کس طرح ہندو لباس پہنایا ہے۔

رامانج خون کی قربانیوں کا سخت مخالف تھا۔[۱] حق تو یہ ہے کہ ہندو سماج میں جہاں کہیں یہ قربانیاں موقوف ہوئی ہیں وہ بھگتی مارگ کی طفیل ہی ختم ہوئی ہیں۔ اس امر سے بھی انجیل جلیل کی تعلیم کا اثر ظاہر ہے۔

رامانج کے سمپردائے کی مختلف رسوم میں سے ایک رسم مسیحی کلیسیا کی عشائے ربانی کی رسم سے مشابہت رکھتی ہے۔[۲] جس پانی سے دیوتا کی مورتی کو دھویا جاتا ہے وہ پی لیا جاتا ہے اور جو کھانا ہری کی نذر کیا جاتا ہے وہ کھا لیا جاتا ہے۔ اس "مہا پرشاد کی رسم" پر مسیحی عقائد کا اثر ظاہر ہے۔ اس میں اور عشائے ربانی کی رسم میں جو مناسبت پائی جاتی ہے وہ اتفاقیہ نہیں ہے کیونکہ اس رسم میں تقدیس شدہ اشیاء کو بیماروں کو دینے کی خاطر عشائے ربانی کی تقدیس شدہ روٹی اور مے کی طرح ریزرو -Reserve. کیا جاتا ہے اور یہ رسم پاک رفاقت کی رسم سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں صرف وہی لوگ شریک ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو اس کے لائق خیال کرتے ہیں۔ اس رسم کے بعد پریتی بھوجن ہوتا ہے جس کے کھانے میں تمام حاضرین شامل ہو جاتے ہیں۔

بھگتی مارگ کے اصول اور مسیحیت

جب ہم بھگتی مارگ کے بنیادی اصولوں پر نظر کرتے ہیں تو ہم

پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ انجیل جلیل کی تعلیم نے ان پندرہ صدیوں کے دوران میں ہندو مذہب کے عقائد پر زبردست اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:-

(۱) مسیحیت کی طرح بھگتی مارگ میں بھی جسم کی زندگی اور روح کی زندگی کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہم جسم کی زندگی کو ترک کر کے ایشور کی خدمت کی خاطر روح کی زندگی کا پیچھا کریں۔ جسم کی زندگی تاریکی ہے لیکن روح کی زندگی نور ہے جو خدا کو پسندیدہ ہے۔ اس مارگ میں ہم کو بیسیوں کہانیاں بتلائی گئی ہیں جب دنیا طلب انسان۔ عیاش۔ ڈاکو وغیرہ نے روحانی بیداری حاصل کر کے پشنو کی خدمت کی خاطر اپنی پرانی بری روشوں کو ترک کر دیا چنانچہ ایک کہانی مُسرف بیٹے کی کہانی (لوقا ۱۵: ۱۱-۳۲) سے ایسی مشابہت رکھتی ہے کہ ڈاکٹر آٹو کہتے ہیں:-

"جب میں نے ہندوستان میں اس کہانی کو پہلی دفعہ پڑھا تو میں مشابہت کی وجہ سے چونک اٹھا۔ اور میں نے بھی دیگر علما کی طرح یہی خیال کیا کہ یہ کہانی مسیحیت سے اخذ کی گئی ہے"! (۳۳)

(۲) بھگتی مارگ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ایشور ہی اکیلا خدا اور خداوند ہے جو غیور خدا ہے اور یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کے جلال و عزت میں کوئی دوسرا شریک کیا جائے پس ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم صرف اسی کی خدمت کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین بنائیں اور اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان سے اس پر بھروسا رکھیں۔ خدا پر کامل ایمان رکھنا نجات کا واحد ذریعہ ہے اور یہ ایمان صرف اس ایک خدا پر یا اس کے اوتاروں پر رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک مقام پر درونا ایک راجہ کو کہتا ہے۔

"اے راجہ۔ صرف خدا پر بھروسا رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح

بچے کسی بات کے لئے فکر نہیں کرتے بلکہ اُن کی ماں ان کے لئے تمام
باتوں کا فکر کرتی ہے اسی طرح لوگ بھی اپنا بھروسا خداوند پر
رکھیں۔ خطرہ اور مصیبت کے وقت اس کی طرف دوڑیں۔ اس
کی خدمت میں ہمیشہ قائم رہیں اور اپنی تمام فکریں اُس پر لاد دیں۔
مجھے پورا یقین ہے کہ جو ہنس کو خوبصورت سفید رنگ عطا کرتا ہے،
اور طوطے کو دل پسند سبز رنگ بخشتا ہے، اور مور کو شنگار دیتا
ہے وہی میری خبر گیری بھی کرے گا۔"

ناظرین اس مثال سے خود دیکھ سکتے ہیں کہ بھگتی مت نے نہ صرف انجیل
کے عقیدہ کو بلکہ کلمتہ اللہ کے پہاڑی وعظ کی مثالوں کو بھی اپنا لیا ہے۔

(۳) بھگتی مارگ کا یہ اصول ہے کہ کوئی شخص محض اپنے بل بوتے اور اعمال
کے وسیلہ جسم کی زندگی کو ترک کرکے روح کی زندگی کو اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ تبدیلی
محض خدا کے فضل کے ذریعہ انسان کو اوپر سے ملتی ہے اور اس کی اپنی کوششوں
کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے:-

"یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو فضل کس طرح ملتا ہے؟ یہ
بات ہم کو ہماری اپنی کوشش یا اعمال حسنہ سے حاصل نہیں ہوتی۔
انسان کا دل توبہ کے ذریعہ بدی کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا اور نہ
غوطہ لینے سے بُرائی دور ہو سکتی ہے۔ صرف ہری کے فضل ہی سے
یہ ہو سکتا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اس کو شہوت سے آزادی بخشتا
ہے۔ اور اپنے عرفان سے سرفراز فرماتا ہے۔"

ہر انجیل خواں اس عقیدہ میں انجیل کا اثر دیکھ سکتا ہے۔

ہم اس رسالہ کے باب سوم میں بتلا چکے ہیں کہ نسطوری مبلغین نے جین د

جاپان کے دُور دراز ممالک میں بھی مسیحی عالمین کی نجات کا پیغام کامیابی سے سنایا تھا چنانچہ ان ممالک میں بدھ مت پر بھی فضل کے مسیحی تصور کا اثر پڑا۔ چنانچہ ایک مشہور چینی تصویر میں برف کی ایک ندی دکھائی گئی ہے جس کی برفانی سطح پر چند آدمی دہکتے کوئلوں کو گھسیٹ کر برف پگھلانے کی بے سود کوشش کر رہے ہیں۔ اس تصویر کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ خدا کی نجات کے پانی کو اپنے بل اور اعمال کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ تمام کوششیں رائیگاں ہوتی ہیں صرف بدھ کا فضل ہی برف کو پگھلا سکتا ہے، اور وہی شخص اس پانی کو حاصل کر سکتا ہے جو ایمان کے ساتھ اس سے دعا کرتا ہے۔

(۴) بھگتی مارگ کے مطابق ہر ایک عمل کا خواہ وہ نیک ہو یا بد، پھل ہوتا ہے لیکن صرف وہی عمل خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں جو خاص اس کی خاطر کئے جائیں ایسے اعمال کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ خدا خود اس کے دل میں آجاتا ہے اور اس میں بھگتی یعنی ایمان کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جس کے وسیلے نجات حاصل ہوتی ہے گناہ بھگتی کی عین ضد ہے اور سچا بھگت جان بوجھ کر گناہ کر ہی نہیں سکتا (مقابلہ کرو ۱۔ یوحنا ۳: ۸ وغیرہ) اور اگر وہ گناہ کرے تو خدا اس کو معاف کر دیتا ہے۔ جس طرح اگر گھر کا دفادار غلام جو آقا سے محبت رکھتا ہے اور محبت کی وجہ سے اس کی خدمت کرتا ہے، کسی شئے کا نقصان کردے تو اس کا آقا اس سے معاوضہ طلب نہیں کرتا بلکہ اس کا جرم اور قصور بخش دیتا ہے۔

مابعد کے زمانہ میں ہندوستان میں فضل کے مسئلہ پر اس سوال کی بنا پر اختلاف برپا ہو گیا کہ آیا خدا کے فضل کے لئے انسانی تعاون کی بھی ضرورت ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ پر دو مختلف گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک گروہ بندر کی مثال دے کر کہتا تھا کہ جب بندر کا بچہ کسی قسم کے خطرہ میں ہوتا ہے تو وہ اپنی ماں سے

چمٹ جاتا ہے اور ماں چھلانگ مار کر اس کو خطرے سے باہر کر دیتی ہے۔ اسی طرح اگرچہ خدا فضل عطا کرتا ہے تاہم انسانی تعاون اور کوشش کی بھی ضرورت ہے۔ دوسرا گروہ بلی کی مثال دے کر کہتا تھا کہ جب بلی کا بچہ کسی طرح کے خطرہ میں ہوتا ہے تو بلی اس کو منہ میں پکڑ کر بھاگ جاتی ہے اور اس کو خطرے سے بچا لیتی ہے۔ اسی طرح خدا کا فضل انسان کو نجات بخشتا ہے لیکن وہ اپنے اعمال کے ذریعہ کوشش کر کے فضل حاصل نہیں کر سکتا۔ ہر انجیل خوان پر ظاہر ہے کہ مقدس پولوس رسول اور مقدس یعقوب دونوں اس سوال پر اپنے خطوط میں بحث کرتے ہیں۔ اور مقدس پولوس کی تعلیم نے ان ہندو مصلحین کو متاثر کر رکھا ہے۔

(۵) بھگتی طریق کے مطابق جو انسان سچے دل سے ایشور کی سیوا کرتا ہے وہ نہ صرف مرنے کے بعد آسمان میں ابدی نجات پاتا ہے بلکہ اسی فانی زندگی میں خدا کی رفاقت اور قربت حاصل کر کے ایک مبارک زندگی بسر کرتا ہے کیونکہ اس کو آرام جان اور کامل اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ ہر انجیل خوان پر ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات اور الفاظ انجیل یوحنا (۵ باب وغیرہ) اور انجیل متی (۱۱: ۲۹) وغیرہ کی صدائے بازگشت ہیں۔

چونکہ ہمارا مقصد یہاں ہندو مذہب اور مسیحیت کے عقائد پر بحث کرنا نہیں بلکہ ہم صرف ان پندرہ صدیوں کے دوران میں مسیحیت کا اثر بتلانا چاہتے ہیں جو اس نے ہندو دھرم پر کیا اس لئے ہم بھگتی مارگ کے عقائد کا تفصیلی بیان کر کے ان کا مقابلہ مسیحی عقائد کے ساتھ کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف تاریخی ہے اور امور بالا سے ناظرین اس اثر کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

رام مت اور مسیحیت کے اصول

وشنو کا دوسرا اوتار رام مانا جاتا ہے۔ رام مت بھی جنوبی ہند میں

شروع ہوا تھا اگرچہ دور حاضرہ میں اس کے پیروؤں کی زیادہ تعداد شمالی ہند میں ہے جہاں زیادہ تر رام کی پرستش قائم ہے وہ نظریہ بھی مسیحی عقائد سے لیا گیا ہے یعنی باپ اور بیٹے کی باہمی محبت اور بیٹے کی کامل فرمانبرداری یہ تعلیم انجیل کی تمام کتابوں اور بالخصوص انجیل یوحنا میں ہر جگہ موجود ہے۔ ڈاکٹر میکڈونل کی رائے ہے کہ رامائن کا پہلا حصہ مسیح سے قبل چوتھی صدی کے درمیان میں لکھا گیا لیکن موجودہ صورت میں یہ کتاب دوسری صدی مسیحی کے آخر میں تالیف کی گئی تھی۔

رامانند

شمالی ہند میں رامانج کی نسبت رامانندی ولشنو زیادہ مشہور ہیں۔ رامانند جو اس سمپردائے کا بانی تھا رامانج کے چیلوں کے سلسلہ میں پانچویں پشت پر آتا ہے۔ اس کے پیرو رام کے پرستار ہیں پس وہ "راماوت" کہلاتے ہیں۔ یہ سمپردائے رامانج کے شری سمپردائے کی ایک شاخ ہے۔ رامانند چودھویں صدی کے اواخر میں سرنگاپٹم کے مٹھ میں قیام کرتا تھا۔ اپنے گرو کی سیوا کرنے کے بعد وہ ہندوستان کی مختلف زیارت گاہوں میں یاترا کرنے کے لئے گیا۔ جب واپس آیا تو سیرائیوں نے گرو کو کہا کہ رامانج سمپردائے کے مطابق ہر شخص اپنا کھانا خود پکاتا ہے اور پوشیدگی میں کھاتا ہے اور اگر کسی دوسرے کی نظر کھانے پر پڑ جائے تو وہ بھرشٹ ہو جاتا ہے اور پھینک دیا جاتا ہے۔ ہم کو یقین نہیں آتا کہ مختلف شہروں کی سیر کرتے وقت اس نے اس دستور کی پابندی کی ہوگی۔ دوسروں کے کہنے سننے سے اس کے گرو نے اس کو الگ جگہ پر بٹھلا دیا۔ رامانند نے اس بے عزتی کو برداشت نہ کیا اور اس نے ایک نیا سمپردائے قائم کر دیا جس میں کھانے پینے وغیرہ کی رسمی قیود کو مٹا دیا گیا۔ اس کے فلسفیانہ خیالات رامانج کے ہی ہیں لیکن رامانج کی اخلاقیات میں اس نے دو باتوں پر بہت زور دیا۔ اول۔ کامل بھگتی یعنی ایمان کا مطلب یہ ہے کہ خدا سے کامل محبت

کی جاسکے۔ اور دوم کہ خدا کے تمام بھگت آپس میں بھائی ہیں۔ اگر کوئی شخص (خواہ وہ مرد
ہو یا عورت) خدا پر خالص اور کامل محبت سے ایمان رکھتا ہے تو اس کی ذات۔ دنیوی
حیثیت۔ درجہ وغیرہ سب ہیچ ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ باتیں نکمی اور غیر ضروری ہیں۔ رامانند
سے پہلے صرف برہمن ہی سمپردائے کے استاد ہوا کرتے تھے لیکن اس نے یہ پابندی
اڑا دی۔ اس کا قول ہے۔

جاتی پاتی پوچھے نہیں کوئے ٭ ہری کو بھجے سو ہری کا ہوئے

یعنی ذات پات کو کوئی نہ پوچھے جو شخص ہری سے محبت رکھتا ہے وہ ہری کا
اپنا ہے۔ ہری سے اس کی مراد رام ہے۔ اسی واسطے جب اس سمپردائے کے پیرو
ایک دوسرے کو ملتے ہیں تو وہ کہتے ہیں "جے رام"۔ "جے شری رام" یا "سیتا رام"
رامانند کے بارہ چیلے تھے جن میں دو عورتیں تھیں۔ ایک راجپوت راجہ تھا۔ ایک مسلمان
جلاہا (کبیر) تھا۔ ایک حجام تھا۔ ایک کسان تھا اور ایک چمار تھا۔ رامانند غالباً پہلا
شخص تھا جس نے مرد اور عورت کی تمیز کو مٹا کر عورتوں کو اپنے بارہ رسولوں میں شامل
کیا تھا۔

رامانند ۱۲۹۹ء میں پریاگ (موجودہ الہ آباد) میں پیدا ہوا تھا۔ جنوبی ہند میں تعلیم
حاصل کر کے وہ شمالی ہند واپس لوٹا۔ ان دنوں میں شمالی ہندوستان میں ہندو دھرم
کے استاد اپنی تعلیم سنسکرت زبان میں دیا کرتے تھے جو صرف علماء کی زبان تھی۔ ان
استادوں کی کتابوں میں علم و فضل کے خزانے تھے لیکن ان سے صرف فضلا ہی فائدہ اٹھا
سکتے تھے لیکن رامانند کے پیرو جُلاہے۔ حجام۔ کسان چمار وغیرہ تھے جو سنسکرت سے
ناواقف تھے پس رامانند لوگوں کو عام فہم ہندی زبان میں تعلیم دیا کرتا تھا اور اس کے
چیلے ہندی ہی میں غزلیں۔ گیت اور کتابیں لکھتے تھے۔ چنانچہ کبیر بڑا زبردست مصنف تھا
رامانند کے طرزِ عمل سے شمالی ہند میں ہلچل مچا دی اور ایک زبردست انقلاب برپا ہو گیا

رامانند اور اس کے چیلوں کی بطفیل ہندی ایک ادبی زبان بن گئی اور رامانندی خیالات نے عوام کے دلوں کو موہ دیا۔ شمالی ہند کے سیاسی حالات نے ان خیالات کے لئے زمین پہلے سے تیار کر رکھی تھی کیونکہ رامانند کی تمام عمر چودھویں صدی ہی میں گذری اور وہ تقریباً ایک سو سال تک زندہ رہا۔ اس کے ایام میں خلجی خاندان کے آخری بادشاہ اور تغلق خاندان کے تقریباً تمام بادشاہ راج کرتے رہے۔ اس نے تیمور کے حملہ اور دہلی کے قتل عام کے منظر ہولناک کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا پس ان سیاسی انقلابات کی وجہ سے اس کے مذہبی خیالات عوام الناس میں نہایت سرعت سے پھیل گئے کیونکہ دکھ اور مصیبت کے ایام میں بھگتی کے عقائد ہی عوام کی تسلی اور اطمینان کا باعث ہو سکتے ہیں۔

رامانند کے وقت سے بھگتی مارگ عوام کا مذہب ہو گیا جس کا پرچار ان کی عام فہم زبان ہندی میں کیا جاتا تھا۔ یہاں سے ہر شخص پر یہ بات عیاں ہو گئی کہ مکتی کا تعلق علم سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق احساسات اور جذبات کے ساتھ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر اور غریب۔ مرد اور زن۔ پیر اور جوان۔ عاقل اور جاہل اس سمپر دائے میں شامل ہو گئے۔ امیروں نے اپنا مال غریبوں میں بانٹ دیا۔ راجوں نے راج پر لات مار کر افلاس اور غریبی کو اختیار کر لیا۔ اودے پور کی رانی میرا بائی نے تاج و تخت کو چھوڑ دینا منظور کر لیا لیکن خوبن شو کی پوجا کرنی منظور نہ کی۔ اس سمپر دائے کے پیروؤں میں ہری داس گویا تھا جو ایسا خوش گلو تھا کہ اس کے گانے کی شہرت سنکر اکبر بادشاہ بھیس بدل کر اس کا گانا سننے کے لئے گیا تھا۔ ان میں چترنج جیسا شخص تھا جس نے سکھایا تھا کہ "نئے سرے سے پیدا ہونا ضروری ہے" (مقابلہ کرو یوحنا ۳: ۷)۔ ان میں گوپال بھی تھا جس کے ایک گال پر طمانچہ مارا گیا تو اس نے دوسرا بھی پھیر دیا (متی ۵: ۳۹)۔ ان میں وِلوا منگل جیسا آدمی تھا جس نے اپنی آنکھیں نکال دی تھیں کیونکہ اس نے ایک عورت کی جانب بری خواہش سے دیکھا تھا (متی ۵: ۲۸-۲۹)۔ ان میں ایک راجہ تھا جس نے اپنا دہنا ہاتھ کاٹ دیا تھا، جو

جو اُس نے بری نیت سے کسی عورت کی طرف بڑھایا تھا (متی ۵: ۲۸، ۳۰)۔ ان چند مثالوں سے جو بطور مُشتے نمونہ از خروارے پیش کی گئی ہیں ظاہر ہو گیا ہوگا کہ انجیل جلیل کا اثر رامانند اور اس کے خیالات اور معتقدات پر اور اس کے سمپر دائے کے پیرووں پر کس قدر گہرا تھا۔ رامانند نے ہندو دھرم کے دائرہ کے اندر رہ کر انجیلی تعلیم پر عمل کر کے انجیلی اصول اخوتِ انسانی کو ثابت کر دیا اور اس کے پیرووں نے پہاڑی وعظ کے الفاظ پر عمل کر کے دکھا دیا۔

مادھو اچاریہ اور مسیحیت

جنوبی ہند کے بڑے اچاریہ مادھو پر بھی مسیحیت کے عقائد اور انجیل جلیل کی تعلیم نے گہرا اثر ڈالا۔ مادھو مغربی ساحل ہند کے ضلع جنوبی کنارا میں مقام اُڈپی سے چھ میل جنوب مشرق کی جانب موضع بیل میں ۱۱۹۹ء میں پیدا ہوا۔ یہ جگہ کلیان کے پاس ہے جو بشپ کا صدر مقام تھا۔ اس کے لڑکپن کے بعض قصے انجیلی کہانیوں کی یاد دلاتے ہیں۔ مثلاً جب وہ پانچ برس کا تھا تو وہ گھر سے غائب ہو گیا۔ اس کے ماں باپ تین دن تک اس کو ہر جگہ ڈھونڈتے رہے اور بہت تلاش کرنے کے بعد انھوں نے اس کو اُڈپی کے اننت الیشور مندر میں پایا۔ جہاں وہ انسانوں اور دیوتاؤں کو تعلیم دے رہا تھا کہ شاستروں کے مطابق وشنو کی پوجا کس طریقہ سے کرنی واجب ہے (مقابلہ کرو لوقا ۲: ۴۰۔ ۵۱)۔

جب مادھو بڑا ہوا تو وہ علم کی تلاش میں جا بجا پھرتا رہا۔ کیونکہ اس زمانہ میں جنوبی ہند کے راجے علما کی قدر کیا کرتے تھے۔ ان کے درباروں میں فضلا اور پنڈت ہر وقت موجود رہتے تھے۔ جنگوں اور فساد کے دنوں میں بھی علما و فضلا ایک ریاست سے دوسری میں آزادانہ آجا سکتے تھے۔ اور کوئی مزاحم نہیں ہوتا تھا۔ علما مختلف ریاستوں میں جا کر پبلک مباحثے اور مناظرے کر کے اپنے حریفوں کو نیچا دکھاتے اور اپنے علم کا

سکھ جاتے تھے۔ راجاؤں کا یہ ایک دلچسپ شغل ہوتا تھا اور وہ ان مناظروں کی سرپرستی کرکے برسرِ دربار فریقین کے دلائل سنا کرتے تھے۔ چنانچہ مادھو نے بھی جگہ جگہ جا کر میدانِ مناظرہ کو جیتا۔ اس نے بحث کرنے کی خاطر اکیس فرقوں کا بخوبی مطالعہ کیا اور اسلام کا کھنڈن کرنے کے لئے فارسی زبان سے واقفیتِ تامہ حاصل کی۔ اندریں حالات یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس نے انجیل جلیل کا مطالعہ کیا تھا کیونکہ اس کی جائے پیدائش کے قریب کلیانہ بشپ کا صدر مقام تھا اور کلیسیا اپنے عقائد کی جا بجا تبلیغ کرتی تھی۔

مادھو پہلے رامانج کی طرح ویدانت کا قائل تھا لیکن بعد میں مسیحی خیالات اور معتقدات سے متاثر ہو کر اس نے بھگتی مارگ اختیار کر لیا۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ وشنو کے بیٹے وائیو کے بغیر نجات کا کوئی اور وسیلہ نہیں جس طرح انجیل یہ تعلیم دیتی ہے کہ خدا کے بیٹے یسوع مسیح کے بغیر نجات کا کوئی دوسرا وسیلہ نہیں (اعمال ۴: ۱۲ وغیرہ) یہ عقیدہ مادھواچاریہ کے ساتھ مخصوص ہے اور ہندو دھرم کے کسی اور مت میں اس قسم کا عقیدہ نہیں پایا جاتا۔ عام مسیحیوں سے اس نے ابدی سزا اور دوزخ کا عقیدہ بھی اخذ کیا۔ وہ ابدی عذاب کا قائل تھا اور کہتا تھا کہ جس انسان کے بُرے کرم حد سے تجاوز کر جائیں گے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔

بھگتی مارگ والے قربانیوں کے خلاف تھے چنانچہ مادھو بھی خونین قربانیوں کا سخت مخالف تھا لیکن وہ کہتا تھا کہ وہ شاستروں کے مطابق ہیں لہذا ان کو بالکل مٹانا نہیں چاہئے پس اس نے زندہ برہ کی خونی قربانی کی بجائے چاولوں سے بنے ہوئے برہ کی قربانی چڑھانے کی تعلیم دی۔ اس نے دیوداسی کی قابلِ اعتراض رسم کو ناجائز قرار دیدیا اور کہا کہ وہ زناکاری ہے۔ اس کے مت کے پجاری ہمیشہ اعلیٰ خاندانوں کے چشم و چراغ سپوت ہوا کرتے تھے۔

انجیلی تعلیم کا اثر نہ صرف اس کی تعلیم پر پڑا ہے بلکہ اس کے سوانح حیات سے بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ مادھو نے وشنو منگلم مقام پر (جو منگلور سے ۲ میل جنوب کی طرف واقع ہے) ایک بیابان میں اپنے پیروؤں کے لئے اعجازی طور پر روٹیوں کی تعداد میں افزائش کر دی (متی ۱۴: ۱۳-۲۱ وغیرہ)۔ ایک اور مرتبہ اس نے پانی پر چل کر دریا کو عبور کیا (متی ۱۴: ۲۲-۳۳) اس کے مذہبی معتقدات کا ذکر کرکے شری سی۔ این کرشنا سوامی آئرایم۔ اے لکھتے ہیں:-

"مادھو کا یہ عقیدہ تھا کہ نجات صرف وشنو کے بیٹے وائو کے وسیلے ہی ہو سکتی ہے اور اس کے بغیر ممکن نہیں۔ ہندوستان بھر میں اس قسم کا عقیدہ کسی دوسری جگہ پایا نہیں جاتا۔ اگرچہ یہ کہنا ہم کو برا معلوم دیتا ہے لیکن اس حقیقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ اس خیال کا تعلق مسیحیت کے عقیدہ سے ہے گو راسخ العقیدہ لوگوں کو یہ کہنا ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا یہ عقیدہ بھی مسیحی تعلیم سے لیا گیا ہے کہ گناہ کی سزا ابدی جہنم ہے۔ علاوہ ازیں اس اچاریہ کی زندگی کے بعض واقعات انجیل سے لئے گئے ہیں۔ مثلاً اچاریہ کا لڑکپن میں اُڈیپی کے مندر میں جا کر تعلیم دینا۔ اپنے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے سے پہلے روزہ رکھنا اور دعا میں لگے رہنا (اعمال ۱۰: ۹ وغیرہ) روٹیوں کی تعداد میں معجزانہ طور پر اضافہ کرنا وغیرہ۔ (مرقس ۸ باب وغیرہ) اس کی تعلیم کی بعض اصطلاحات اور فقرے تک انجیل سے اخذ کئے گئے ہیں۔ مثلاً "خوشخبری دینا" (مرقس ۱: ۴ او ۱۵ وغیرہ) "آدمیوں کا شکار کرنا" (مرقس ۱: ۱۸ وغیرہ)۔ یہ باتیں محض اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں۔"[۳۰]

کبیر اور مسیحیت

راما نند کے چیلوں میں کبیر سب سے زیادہ مشہور ہے اس کا زمانہ ۱۴۴۰ء سے ۱۵۱۸ء تک تھا۔ اس کی تمام عمر بنارس کے مضافات میں گذری جہاں

وہ جلاہے کا کام کرتا تھا اور عوام کو تعلیم دیتا تھا۔ شمالی ہند کی مذہبی دنیا میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

کہتے ہیں کہ رامانند کا ایک برہمن چیلا تھا جس کی ایک نوجوان بیٹی بیوہ ہو گئی تھی۔ لیکن وہ کنواری تھی۔ ایک دن وہ اپنی بیٹی کے ساتھ رامانند کے پاس گیا جس کو معلوم نہ تھا کہ بیٹی بیوہ ہے اور لاعلمی سے اس کو آشیرباد دی کہ تو بہرتی ہو۔ گرو کے بچن کی وجہ سے وہ حاملہ ہو گئی اور شرم کے مارے ایک پوشیدہ جگہ جا کر چپکے سے بچہ جنی اور اس کو چھوڑ کر چلی آئی۔ اتفاقاً ایک جولاہا اور اس کی بیوی اُدھر سے گذرے۔ انہوں نے بچہ کو اٹھایا اور اس کو پالا۔ یہ بچہ کبیر تھا پس وہ ہندوؤں کی اولاد تھا اور مسلمانوں کے گھر میں پلا تھا۔

کبیر کی زندگی کے بعض قصے انجیلی بیانات کی صدائے بازگشت ہیں[۳۹]۔ مثلاً کہ وہ بغیر باپ کے کنواری سے پیدا ہوا۔ جب وہ ابھی لڑکا ہی تھا تو اس نے عالموں اور پنڈتوں سے بحث کی اور میدانِ مناظرہ کو جیت لیا۔ عوام الناس اس کو اچھوتوں اور گنہ گاروں کے ساتھ میل جول رکھنے کی وجہ سے ملامت کا نشانہ بناتے تھے۔ اس نے غریبوں کو معجزانہ طور پر روٹی کھلائی۔ پنڈت اور دینی پیشوا اس کے جانی دشمن بن گئے۔ اس نے ایک مردہ لڑکے کو زندہ کر دیا۔ ایک اور دفعہ اس نے ایک مردہ لڑکی کو پھر زندہ کر دیا۔ عورتیں اس کی خدمت کیا کرتی تھیں (مقابلہ کرو لوقا ۸: ۲، ۳) سکندر لودھی بادشاہ کی عدالت میں اس کا پیش ہونا ہم کو مسیح کا پلاطوس کی عدالت میں پیش ہونے کا واقعہ یاد دلاتا ہے۔ اس نے ایک شخص کو کہا کہ اگر تجھ میں ایمان ہے تو تو پانی پر چل سکتا ہے۔ چنانچہ وہ ایمان کی وجہ سے پانی پر چلنے لگا۔

رامانند کا چیلا ہونے کی وجہ سے وہ وشنومت کا معتقد تھا۔ لیکن اس نے ہندو دھرم کے ظاہری نشانات کو رد کر دیا۔ وہ ذات پات کا سخت مخالف تھا اور

ریاضت۔ فاقہ کشی اور خیرات کرنے کو اچھا نہیں جانتا تھا۔ وہ ہندو فلسفہ سے بیزار تھا اور شرک اور دیوتاؤں کی ہستی کا منکر تھا خدا کی وحدانیت اس کی تعلیم کی بنیاد ہے اگرچہ وہ خدا کے لئے لفظ "رام" استعمال کرتا ہے تاہم یہ ظاہر ہے کہ اس سے اس کا مطلب وشنو کا اوتار نہ تھا۔ اس کی یہ تعلیم تھی کہ نجات علم یا نیک اعمال سے نہیں ملتی بلکہ حقیقی نجات صرف کامل ایمان سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کبیر کا یہ شعر مشہور ہے۔ ؎

مالا لکڑ، دیوا پتھر، گنگا جمنا پانی ۔۔۔ رام کرشن دونوں مر گئے چاروں وید کہانی

کبیر نے انجیل یوحنا کے پہلے باب کی تعلیم "کلام" کو اپنا لیا ہے۔ ایک دفعہ وہ گنگا کے کنارے جا رہا تھا تو بھوک کے مارے بے حال ہو کر ایک جھونپڑی کے قریب بیٹھ گیا۔ ایک عورت اس کے لئے کھانا اور پانی لائی لیکن اس نے خوراک کی طرف توجہ نہ کی اور کہا "خدا کا کلام میرا کھانا ہے۔ ہم شبد آہاری ہیں" (یوحنا ۴باب ۳۴)

کبیر کی تعلیم کے بیسیوں الفاظ اور فقرے اناجیل اربعہ کی آیات کی یاد دلاتے ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ اس نے بادشاہ سکندر لودھی کو کہا "میں نے اونٹ کو سوئی کے ناکے میں سے جاتے دیکھا ہے" (متی ۱۹: ۲۴ وغیرہ) وہ کہتا تھا کہ "میں سادھوؤں کے اندر رہتا ہوں اور سادھو میرے اندر بستے ہیں۔" "میں ان کی روٹی ہوں۔" (یوحنا ۶: ۳۵ و ۴۸ و ۵۲ وغیرہ)۔ "کوئی شخص خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔" (لوقا ۱۶: ۱۳) "خدا غیرت والا خدا ہے۔" (استثنا ۴: ۲۴۔ مرقس ۱۱/۱۵) "وہ دولت جمع کرو جس کو چور چرا نہیں سکتا اور جس کو آگ جلا نہیں سکتی" (متی ۶: ۱۹-۲۱)۔ "جو جیتے جی مر جاتا ہے وہی درحقیقت زندہ ہے۔" (یوحنا ۱۲: ۲۴ و ۲۵) "ایک ہیرا راہ کی مٹی میں پڑا ہوا تھا۔ لوگ پاس سے گزر گئے لیکن جس کو ہیرے کی پہچان تھی اس نے اس کو پا لیا۔" (متی ۱۳: ۴۴-۴۶) "اگر تم دوسرے کے قصور معاف نہیں کرو گے

تو خدا کو نہ دیکھو گے۔" (متی ۱۶؛۱۴-۱۵ وغیرہ) "ظاہری پاکیزگی صرف جسم کو ہی صاف کر سکتی ہے لیکن باطن کو پاک نہیں کر سکتی" (مرقس ۷؛۱۰-۲۳ وغیرہ) "انسان ایمان ہی سے نجات حاصل کر سکتا ہے نہ کہ اعمال سے۔" (افسی ۲؛۸-۹ وغیرہ) "خدا پر ایمان رکھو۔ جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ خوف نہیں کھاتے کیونکہ کامل محبت خوف کو دور کر دیتی ہے" (مرا ۱؛۲۲-ایوحنا ۴؛۱۸)۔ "اگر خدا تمھارا ختنہ چاہتا تو وہ تم کو دنیا میں مختون کر کے پیدا کرتا" (گلتی ۵/۶ - ۶/۱۵ وغیرہ) "کیا بڑہم بڑا ہے یا وہ جس سے وہ پیدا ہوا۔ کیا وید بڑا ہے یا وہ جس کی طرف سے وہ آیا" (متی ۲۳؛۱۷-۱۹ وغیرہ)۔ "وہ (یعنی دین کے بادی) پتیل اور پتھر کی پوجا کرتے ہیں۔ اپنی یاتراؤں پر اتراتے ہیں، وہ ہار پہنتے ہیں۔ اپنے ماتھوں پہ ٹیکے لگاتے ہیں۔ اور بازوؤں پر نشان باندھتے ہیں۔ وہ زبان سے دیوتاؤں کی حمد کرتے ہیں لیکن انھوں نے خدا کو ترک کر دیا ہے" (متی ۲۳ باب)۔ "مجھے کوئی یہ تبلائے کہ تیرتھ بڑا ہے یا ہری کا پجاری بڑا ہے" (متی ۲۳؛۱۶-۱۷) "جس کا دل ناپاک ہے خواہ وہ تیرتھ جا کر اشنان کرے وہ بہشت میں داخل نہیں ہوگا" (متی ۲۳؛۲۵-عبرانیوں) "میری تعلیم شبد (کلام) کی بابت ہے۔ اس کو سنو اور آوارگی اختیار نہ کرو۔ اگر کوئی سچائی کو سننا چاہتا ہے تو وہ شبد کی سنے" (ایوحنا ۱؛۱-۵ + لوقا ۸؛۱۱؛۳) "کلام (شبد) سے دنیا کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔" (مرقس ۱؛۲-۵ وغیرہ) "کلام (شبد) کے بغیر دنیا تاریک ہے۔" (یوحنا ۸؛۱۲) "شبد (کلام) ہی حقیقی دروازہ ہے" (یوحنا ۱۰؛۹)۔ "ذرا سوچو تو کہ دنیا کہاں سے آئی اور کہاں جا رہی ہے۔ کبیر کہتا ہے کہ میں اس شبد (کلام) کا عاشق ہوں جس نے نادیدہ خدا کو ہم پر ظاہر کر دیا" (یوحنا ۱؛۱۸ وغیرہ) "رام نام کے بغیر کسی دوسرے وسیلے سے نجات نہیں۔" (اعمال ۴؛۱۲)۔ "اگر استاد اندھا ہے تو شاگرد کیا کر سکتے ہیں؟ اگر اندھا اندھے کو راہ دکھلائے گا تو دونوں کنوئیں میں گریں گے۔" (متی ۱۵؛۱۴ وغیرہ) "جس نے تمام دنیا کو پیدا کیا وہ گرو ظاہر ہوا جس گرو نے اس کو

اپنی آنکھوں سے دیکھا اسی نے اس گرد کو ہم پر ظاہر کیا۔" (ایوحنا ۱: ۱-۳) "مجلتی کا دروازہ تنگ ہے۔ وہ رائی کے دانے کا بھی دسواں حصہ ہے۔ جس شخص کا دل غرور سے پھول گیا ہو وہ اس میں کس طرح داخل ہو سکتا ہے۔" (متی ۷: ۱۳)۔ "اصل محبت وہی شخص کرتا ہے جو اپنی جان دوسروں کے لئے دے دیتا ہے" (ایوحنا ۱۵: ۱۳) "جو دوسروں کے سر پر تلوار چلاتا ہے وہ خود قتل ہو جائے گا۔" (متی ۲۶: ۵۲) "جو اپنی جان بچاتا ہے وہ اس کو کھوتا ہے۔ جو اپنا سر کھوتا ہے وہ اس کو پاتا ہے۔" (متی ۱۰: ۳۹ وغیرہ) "سادھو کے ہاتھ میں چھاج ہے جو شے وزندار ہے وہ اس میں رہ جاتی ہے لیکن ہلکی شے ہوا سے اڑ جاتی ہے۔" (متی ۳: ۱۲) "فکر نہ کرو کیونکہ دینے والا قادر ہے۔ میدان کے جانداروں کو دیکھو۔ پرندوں کو دیکھو۔ وہ نہ جمع کرتے ہیں اور نہ دولت پیدا کرتے ہیں۔" (متی ۶: ۲۵-۳۴)۔ "اے خدا۔ جو میں نے کیا وہ تو نے کیا۔ میں نے خود کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ میں نے کیا وہ صرف تیری قوت اور طاقت کی بدولت کیا" (فلپی ۲: ۱۳)۔ "خدا سب سے بزرگ اور قادر ہے تاہم وہ دنیا میں فقیری کی حالت میں رہا۔" (فلپی ۲: ۵-۸ + لوقا ۹: ۵۸ وغیرہ)۔ "اگر تم کسی فقیر کو دیکھو تو اس کے چرنوں کو ہاتھ لگاؤ۔ کیا معلوم خدا اس روپ میں تمہارے پاس آیا ہو۔" (متی ۲۵: ۴۰ و ۴۵ وغیرہ)۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ کبیر پر انجیل جلیل کا اور بالخصوص مقدس یوحنا کی تصنیفات کا خاص اثر ہوا تھا۔ کبیر پنتھ کے اسلامی حصے کا فرقہ اپنے مٹھ میں ہر سال میلہ کرتا ہے جس میں عبادت کے وقت کبیر پنتھی کو کھچڑی کا ایک لقمہ دیا جاتا ہے اور لوٹے کے منہ میں سے اس کی ہتھیلی پر ایک گھونٹ پانی ڈالا جاتا ہے جس کو ہر ایک پرستار کھاتا اور پیتا ہے۔ جو شے بچ رہتی ہے اس کو پجاری کھا پی لیتا ہے۔ اس کے بعد چند دعائیں کی جاتی ہیں اور عبادت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ رسم عشائے ربانی کی رسم یاد دلاتی ہے

کبیر پنتھ کا ہندو فرقہ بھی اسی قسم کی رسم ادا کرتا ہے جس کو "جوت پرشاد" کا نام دیا جاتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو اس میں شامل ہونے کے لائق خیال نہیں کرتا وہ عبادت کے دوران میں جوت پرشاد کی رسم کے عمل میں آنے سے پہلے چلا جاتا ہے۔ یہ خوراک کبیر کا خاص عطیہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ خوراک بیماروں اور مرنے والوں کو دی جاتی ہے اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ ناپاک ہونے نہ پائے۔ اس عبادت کے بعد پریتی بھوجن ہوتا ہے[۲۴۲]۔

بھگتی مارگ اور گناہ کا مفہوم

مسیحیت کی آمد کی وجہ سے بعض ہندو عقائد اور تصورات کے معانی کلیتہً بدل گئے۔ یہاں ہم اختصار کی خاطر صرف گناہ کے مفہوم کی مثال لیتے ہیں۔ ہندو دھرم میں گناہ کا تصور کرم اور آواگون کے چکر کے ساتھ وابستہ تھا۔ اور مکتی کا مطلب یہ تھا کہ انسان کو اس چکر سے رہائی ملے۔ ہندو مذہب اور فلسفہ میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جو گناہ کے اخلاقی مفہوم کو ادا کر سکے[۲۴۳]۔ بعض اوقات لفظ گناہ کے لئے "کلیش" استعمال کیا جاتا ہے لیکن کلیش اس دُکھ کا نام ہے جو انسان کی مقید آتما سنسار کی قید میں پڑنے کی وجہ سے اٹھاتی ہے۔ لفظ "پاپ" بھی گناہ کے مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہے کیونکہ مسیحی اصطلاح میں گناہ اس محبت کے تعلق کے ٹوٹنے کا نام ہے جو خدا اور انسان میں ہے۔ اسی طرح لفظ "مکت" نجات کے مسیحی مفہوم کو ادا نہیں کر سکتا کیونکہ ہندو دھرم میں مکت اس چکر سے رہائی پانے کا نام ہے جس میں انسان کی آتما پھنسی ہوئی ہے۔ ہندو مذہب کے مطابق گناہ کا احساس اور شکستہ دل ہونا بجائے خود کلیش ہے، جو انسان کی قید کو اور بھی سخت کر دیتا ہے اور جس کا ٹوٹنا آتما کی رہائی کے لئے

ضروری اور لازمی امر ہے۔ بالفاظِ دیگر ہندو مذہب کے لئے توبہ۔ نجات۔ قدوسیت اور پاکیزگی وغیرہ تصورات جو مسیحیت پیش کرتی ہے بالکل نئے اور نرالے تھے جنہوں نے ہندو دھرم کے مصلحین کے خیالات کو متاثر کیا۔ بھگتی مارگ میں لفظ گناہ کا وہ مفہوم نہ رہا جو ہندو دھرم میں صدیوں سے چلا آیا تھا۔ رامانج نے یہ تعلیم دی کہ گناہ ایک ایسی شے ہے جو ایمان کے عین ضد ہے اور ایشور کی محبت کے خلاف کسی بات کا کرنا گناہ ہے۔ اس نے گناہ کے مفہوم میں انقلابی تبدیلی کر دی اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر نیک اعمال بھی ایشور کی خالص بھگتی کی نیت سے نہ کئے جائیں تو وہ بھی گناہ محسوب ہوں گے۔

شیومت اور مسیحیت کی تعلیم

سطورِ بالا سے ظاہر ہو گیا ہے کہ انجیلِ جلیل کے اصول نے ویشنو مت پر بڑا زبردست اثر کیا۔ اسی طرح شیومت مسیحیت کے خمیر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اوائل مسیحی صدیوں میں جنوبی ہندوستان میں جین مت اور بدھ مت کا بول بالا تھا۔ پہلی صدی کے شروع (۲۳ء) سے کر تیسری صدی کی ابتدا (۲۱۵ء) تک بدھ مت ہر جگہ عموماً اور تیلگو علاقہ میں خصوصاً پھل پھول رہا تھا۔ لیکن جین مت روح کے وجود کا منکر تھا اور بدھ مت کسی شخصیت رکھنے والے خدا کو نہیں مانتا تھا۔ پس ان مذاہب کا زوال ایک لازمی امر تھا۔ کیونکہ انسانی فطرت اس قسم کے عقائد سے تسکین اور تسلی حاصل نہیں کر سکتی۔ پس جنوبی ہند میں شیومت فروغ حاصل کرنے لگا جس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ پرستار ایک ایسے معبود کے ساتھ رفاقت رکھ سکتے ہیں جو شخصیت رکھتا ہے۔ پس یہ مذہب جنوبی ہند کے باشندوں کا قومی مذہب ہو گیا اور آہستہ آہستہ جین مت اور

بدھ مت پر غالب آگیا۔ اس کی طفیل جنوبی ہند کے باشندے ایک ایسے معبود کو ماننے لگے جس نے اپنے فضل سے کائنات کو خلق کیا جس میں انسانی روح اپنے کرموں کا پھل پاتی ہے اور تناسخ کے چکر سے مکتی حاصل کر سکتی ہے۔ مانِک واچگر جس کا ذکر ہم اس رسالہ کے باب دوم کی دوسری فصل میں کر چکے ہیں اس مت کا نہایت زبردست پرچارک تھا۔

جنوبی ہند کا شدھ شو سدھانت ہمیشہ ادویت فلسفہ اور شنکر آچاریہ کے مایا کے تصور کا مخالف رہا۔ اس سدھانت کے مطابق انسانی روح کی انفرادی حالت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اگرچہ وہ نجات کی حالت میں خدا کی قربت سے شادکام ہوتی ہے تاہم وہ خدا کی ذات میں کبھی فنا نہیں ہوتی۔ اس عقیدہ سے مسیحیت کی تعلیم کا اثر ظاہر ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر پوپ (G. U. Pope) کہتے ہیں کہ "اس امر میں شومت کی تعلیم اور مسیحی تعلیم میں کسی قسم کا فرق نظر نہیں آتا۔"

پانچویں صدی مسیحی سے گیارھویں صدی مسیحی تک شومت کے شاعروں نے اپنے گیتوں اور غزلوں میں شو پر ایمان رکھنے کی برکات کا بار بار ذکر کیا ہے۔ ان گیتوں میں جا بجا شو کے فضل کی معموری کا بیان ہے۔ یہ صرف شو کے فضل کا نتیجہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو پرستاروں پر بے مثال محبت اور بے انتہا صورت میں ظاہر کیا ہے۔ چولا اور پلوا سلطنتوں کے راجے اس مت کے پیرو تھے اور انہی مقامات میں مسیحی کلیسیائیں جا بجا قائم تھیں اور انجیل جلیل کا خمیر اپنا کام کر رہا تھا۔ ہم اس مضمون کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتے۔ پس اختصار کی خاطر ڈاکٹر فریزر کے الفاظ پر ہی قناعت کرتے ہیں۔ یہ عالم کہتا ہے:-

"آٹھویں اور نویں صدی کے بعد کی ٹامل کتب میں غیر متوقع طور پر جا بجا اچانک ایسے الفاظ۔ فقرے اور محاورے ملتے ہیں جن سے مسیحی تاثرات ہر جگہ نظر آتے ہیں۔"

اس باب کے مضمون سے ظاہر ہے کہ اگرچہ ہندوستان کی کلیسیائے منجی عالمین کی نجات کی بشارت دینے اور انجیل جلیل کی اشاعت کرنے میں مجرمانہ کوتاہی کی تاہم ان پندرہ صدیوں کے عرصہ میں "دنیا کے نور" کی شعاعوں نے ہمارے ملک کے طول و عرض میں ہندو مصلحین کے خیالات۔ اصطلاحات اور معتقدات کے ذریعہ اپنی روشنی سے اس ظلمت کدہ کو منور رکھا۔ قدیم زمانہ ہی سے ہندو یاترا کی خاطر دُور دراز کے تیرتھوں میں جایا کرتے تھے خواہ وہ ہندوستان کے شمال میں واقع تھے یا جنوب میں واقع ہوتے تھے۔ ان یاتراؤں میں وہ ایسے استادوں سے تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے جو اپنی تعلیم کے باعث چار دانگ عالم میں مشہور تھے۔ پس اغلب ہے کہ ان یاتریوں میں سے بہتوں نے مختلف صدیوں میں مختلف مقامات کے انجیل کے خادموں سے خدا کی محبت کا پیغام سنا تھا۔ انجیل کے اصول اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے چنانچہ انھوں نے شمالی اور جنوبی ہند کے عوام ہندوؤں کے خیالات کو متاثر کر دیا۔

علاوہ ازیں ہند کے بعض راجے علم و فضل کے قدردان تھے[۱]۔ ان کے درباروں میں مختلف خیالات اور عقائد کے علماء موجود رہتے تھے بعض راجے ایسے وسیع الخیال واقع ہوئے تھے کہ ان کے درباروں میں مسیحی علماء بھی رہتے تھے۔ چنانچہ ۶۳۹ء قنوج کے مشہور و معروف مہاراجہ ہرش کے مربی راجہ شیلادتیہ کے دربار میں سریانی کلیسیا کے مسیحیوں کا ایک وفد پادری الوپن (Alopen.) کی زیر سرکردگی گیا تھا۔ شلہ

ان مختلف طریقوں سے خدا کی بے پایاں محبت اور شفقت، اس کے رحم و فضل کے تصور نے اور

منجیٔ عالمین کی نجات اور خدا کی بادشاہت کے تصورات نے شرک اور بت پرستی کے درمیان اپنے لئے مستقل جگہ پیدا کرلی اور خدا کی روح ہندوستان کے پانیوں پر جنبش کرتی رہی۔ گذشتہ دو ہزار سال سے ہندو مذہب کے پیرو مسیحیت کی طفیل ایک ایسے معبود پر ایمان رکھتے چلے آئے ہیں جو شخصی صفات سے متصف اور محبت اور فضل کرنے والی واجب الوجود ہستی ہے۔ ہم قیاس کرسکتے ہیں کہ اگر مسیحی کلیسیا اپنے خداوند سے وفاشعاری اختیار کرکے ناموافق حالات میں بھی فرض شناس ہوکر انجیل جلیل کا جانفزا پیغام ہر کس وناکس تک پہنچا دیتی تو ہندوستان کبھی کا اپنے حقیقی منجی کے قدموں میں آکر جنت نشان بن گیا ہوتا۔

ضمیمہ (الف)

کتاب صفحہ ۳۶

مانک واسگر

یہ مانک واسگر کون تھا؟ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ شخص بدعتی مسیحی مانی کا پیرو تھا اسی لئے اس کو مانکی کہتے تھے۔ ممکن ہے کہ اس کے نام کا مطلب ہی یہ ہو۔ (مانک = مانی کا پیرو۔ اور واسگر = جادوگر) ۔ اگر یہ درست ہے تو یہ شخص وہ نہیں جو ساتویں صدی میں زرتشت مت کا مشہور مبلغ اور شاعر تھا۔

مانی ۲۱۶ء کے قریب بغداد کے قریب وجوار میں پیدا ہوا۔ اس نے ۲۴۲ء میں اپنی تعلیم کا پرچار شروع کیا جب شاپور اول کی تاجپوشی کی رسم ادا ہوئی تھی اس نے دُور دراز کے سفر اختیار کئے اور مرکزی ایشیا۔ ہندوستان اور چین کے ملکوں میں سیاحت کی۔ بالآخر بہرام اول کے حکم سے اس کی زندہ کھال کھینچی گئی۔ تیسری صدی میں اس کے شاگردوں نے اس کے عقائد کو دریائے سندھ کے دہانہ میں پھیلایا۔ ڈاکٹر ہیننگ کہتا ہے کہ اس کے ایک اور شاگرد مار اَمّو (-Anune) نے (جو اس بدعت کا "رسولِ مشرق" تھا) اس بدعت کو کوہ ہندوکش کے پار شمال مغربی ہندوستان میں پھیلا دیا جہاں پہلے کشانوں کی سلطنت ہوتی تھی۔ یعنی "مرو کے پار بلخ تک" کے لوگ مانی کے پیرو ہو گئے۔ اور افغانستان کے شمال

کی جانب جو علاقہ اب "افغانی ترکستان" کہلاتا ہے اس میں ابتدائی صدیوں میں ایسے مسیحی فرقے بستے تھے جو بدعتی تھے چنانچہ دورِ حاضرہ میں کھوج لگانے والوں کی متواتر اور ان تھک کوششوں کی طفیل ہم کو چینی ترکستان اور بالخصوص تُرفان کے نخلستان میں مسیحی دستاویزیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کتابوں میں ایک بڑی تعداد مانی کے عقائد سے متعلق ہے۔ یہ کتابیں دسویں صدی سے پہلے مانوی فرقہ کے پیروؤں کے لئے لکھی گئی تھیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ صدیوں تک یہ خطہ مسیحیت کے اہم مرکزوں میں سے تھا۔

ممکن ہے کہ اوآ نے اپنے مبلغین کو سندھ کے دہانہ سے وسط ہند کے راستے ۳۱۵ء میں ساحل کورومنڈل بھیجا ہو اور انھوں نے وہاں جا کر شومت کے عقائد کو بھی اپنے زرتشتی اور ناستک عقائد کے ساتھ ملا لیا ہو۔ اور وہاں سے کوئی جوشیلا مبلغ ساحل مالابار گیا ہو اور وہاں کے مسیحیوں کے ارتداد کا باعث بنا ہو۔ ان امور پر ہم وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان پر ابھی تاریخ کی روشنی کی زیادہ ضرورت ہے۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں یعنی چوتھی صدی کے اوائل میں شومت نے جنوبی ہند میں زور پکڑ لیا تھا۔ اور یہ مذہب وہاں کے باشندوں کا قومی مذہب ہو گیا۔ پس اغلب ہے کہ متعدد مسیحی اس لہر سے متاثر ہو کر راہِ حق سے منحرف ہو گئے ہوں۔

ضمیمہ (ب)

راجہ پلّی والنور

مالابار کے نمبودری برہمنوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ مالابار کے چیرا خاندان کے راجہ پلّی والنور نے ہندو دھرم کو ترک کر کے مسیحیت اختیار کر لی تھی جس کی وجہ سے اس کو تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے اس راجہ کا نام "پلّی والنور" یعنی گرجا میں رہنے والا پڑ گیا۔

تین ہندو دستاویزوں میں جو کھجور کے پتوں پر لکھی ہیں (جن کی کوچین محل کے افسر مسٹر مینن (V. K. Menon.) نے جانچ پڑتال کی ہے) تاریخی مادہ (Chronogram.) لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے "خدا کی بادشاہی جس کا پرچار بغداد کے مبلغین نے کیا ہے درحقیقت نزدیک ہے۔" ان میں لکھا ہے کہ جب یہ راجہ مسیحی ہو گیا تو اس نے یہ کوشش کی کہ اس کی رعایا بھی مسیحیت کی حلقہ بگوش ہو جائے۔ مسٹر مینن کے خیال میں تاریخی مادہ کے مطابق یہ واقعہ سنہ ۳۱۷ء میں ہوا۔ کرنگانور کے آرچ بشپ روز (Roz.) نے جو کتاب سنہ ۱۶۰۱ء میں لکھی تھی اس میں اس راجہ کی وفات کی تاریخ سنہ ۳۱۷ء ہے یہ کتاب قلمی نسخہ لندن کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔

یوسی بیئس اپنی کتاب "حیاتِ کانسٹن ٹاین" میں لکھتا ہے کہ ہندوستان کے ایک راجہ نے شاہ کانسٹن ٹاین کو سنہ ۳۳۶ء میں بیش قیمت تحائف بھیجے تھے۔ لیکن

ہے کہ یہ راجہ وہی کرنگانور کا مسیحی راجہ پلی والنور رہو اور اس نے نیلن پریوُر (نیلن بمعنی
تُرش اور پریوُر = بڑا گاؤں) کے گرجا میں جانے سے پہلے اس سفارت کو قیصر
کانسٹن ٹائین کے پاس بھیجا ہو۔

فہرستِ اغلاط

(۱) سرورق قیمت عہ۱۲ کی بجائے قیمت دُو روپیہ

(۲) صفحہ ۱۶ سطر ۱۴، ۱۰ سـہ۱

(۳) ″ ۸۸ سطر ۹ سـہ۱

(۴) ″ ۲۲۸ نوٹ کی دوسری سطر Q کی بجائے α پڑھو

(۵) ″ ۲۴۱ سطر ۹ سـہ۳۰

(۶) ″ ۲۴۶ ″ ۱۶ سـہ۴۱

ضمیمہ (ب)

یہ کتابی نسخہ لندن کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔

یوسی بیئس اپنی کتاب "حیاتِ کانسٹن ٹاین" میں لکھتا ہے کہ ہندوستان
کے ایک راجے نے شاہ کانسٹن ٹاین کو ۳۳۶ء میں بیش قیمت تحائف بھیجے تھے لیکن

ہے کہ یہ راجہ وہی کرنگانور کا مسیحی راجہ پلی وانور ہو اور اس نے نیلن پریوٹر (نیلن یعنی شو اور پریوڈر یعنی بڑا گاؤں) کے گرجا میں جلنے سے پہلے اس سفارت کو قیصر کانسٹن ٹاین کے پاس بھیجا ہو۔

37. Grierson, Art. Bhakti Marga in E. R.-E., vol. ii.
38. The Three Great Acharyas, p. 282.
39. G. H. Westcott, Kabir and Kabir Panth, p. 36.
40. R. Burn, Art. Kabir in E. R. E., vol. 7, p. 632*b*.
41. Westcott, Kabir and Kabir Panth, ch. 4.
42. *Ibid*, ch. 5.
43. Rudolf Otto, India's Religion of Grace and Christianity, ch. 4.
44. Frazer, Art. Dravidian in E. R. E., vol. v, p. 22*b*.
45. R. W. Frazer, Art. Saivism in E. R. E., vol. xi, p. 95*b*.
46. G. U. Pope, The Tiruvacagam, Oxford 1900, p. lxv.
47. R. W. Frazer, Art. Dravidian in E. R. E., vol. v, p. 22*b*.

6. Bhagwad Gita (Sacred Books of the East), vol. 8, p. 34, and Vaisnavism, Saivism and Minor Religious Systems, p. 13.
7. Bhagvad Gita, *Ibid.*
8. See Radhakrishnan's Indian Philosophy, vol. i, p. 524.
9. *Ibid*, p. 527.
10. Encyclopaedia of Religion and Ethics, art. Bhagvad Gita by R. Garbe, p. 536*a*.
11. See S. D. Budhi Raja, Bhagwad Gita, a study, pp. 30-31.
12. *Ibid*, p. 60.
13. R. Garbe in E. R. E., p. 538*b*.
14. Lorinser, Indian Antiquary, ii, 283.
15. G. A. Jacob, A Manual of Hindu Pantheism, p. 36.
16. *Ibid*, p. 36.
17. G. Howell, The Soul of India (1913). Also Farquhar, Gita and the Gospel, pp. 70-71.
18. Radhakrishnan, Indian Philosophy, i, 559-565.
20. See Radhakrishnan, vol. i, p. 494.
21. Indian Literature.
22. Weber, Indian Antiquary, ii, 285, iii. 21 etc., vi. 161 etc. Also Grierson, in Journal of Royal Asiatic Society, "Modern Hinduism and its Debt to the Nestorians," 1907.
23. J. Kennedy, "The Child Krishna, Christianity, and the Gujars." (Journal of Royal Asiatic Society, p. 951 ff).
24. See Radhakrishnan's Indian Philosophy, i, 489.
25. *Ibid*, pp. 493-496.
26. Grierson, Bhakti Marga in E. R. E., ii, pp. 540ff.
27. Jacob, A Manual of Pantheism (Trubner's Oriental Series), pp. 35-6.
28. S. Krishnaswami Aiyangar, 'Sri Ramanujacharya' in Three Great Acharyas, p. 115.
29. Grierson, Bhakti Marga in E. R. E., vol. ii.
30. The Three Great Acharyas (Natesan & Co., Madras).
31. *Ibid.*
32. G. H. Westcott, Kabir and Kabir Panth, p. 127.
33. Rudolf Otto, India's Religion of Grace and Christianity, appendix 6, p. 136.
34. Macdonell, Art. Ramayana in E. R. E., X, 574-575.
35. Grierson, "Bhakti Marga", E. R. E., vol. ii.
36. C. N. Krishnaswami Aiyer, Shri Madhwacharya in the Three Great Acharyas.

Chapter 4.

1. Mingana, Early Spread of Christianity in India, pp. 63-67.
2. Stewart, Nestorian Missionary Enterprise, p. 85.
3. Bulletin of the John Rylands Library, vol. X, 2, p. 437.
4. Mingana, Early Spread of Christianity, p. 64.
5. *Ibid*, p. 35.
6. *Ibid*, p. 32.
7. Barhebraeus, Chron. Eccl. iii, 169-171.
8. Bulletin of John Rylands Library, vol. X 2, p. 486.
9. Hakluyt Library, First Series, vol. xxii, p. 41.

Chapter 5.

1. B. Thorpe, The Anglo-Saxon Chronicle, ii, 66.

Chapter 6.

1. Chronique de Seert, in Pat. Or. vii, 116-117. Quoted by Mingana, p. 28.
2. W. Hunter, Indian Empire, p. 231.
3. Fisher, History of the Christian Church, p. 98.
4. Mingana, Early Spread of Christianity in India, p. 31.
5. C. P. T. Winkworth, A New Interpretation of the Pahlvi Cross—Inscriptions of Southern India (Journal of Theological Studies, April 1929, pp. 237-244).
6. Winkworth, *Ibid.*
7. Commentaries of Albuquerque, Hakluyt Society, 1875, i, 14.

Chapter 8.

1. Gazetteer of Kanara District of Bombay Presidency, vol. xv, p. 397.
2. W. Hunter, The Indian Empire, p. 240.
3. S. K. Datta, The Desire of India, chap. 2.

Chapter 9.

1. Weber, History of Indian Literature, p. 188, Muir, Sanskrit Texts, iv, 169. Also Dr. Farquhar's books.
2. Hastings, Encyclopaedia of Religion and Ethics, vol. ii, p. 549*a*.
3. S. Radhakrishnan, Indian Philosophy, vol. i (Indian ed.), p. 500.
4. Hopkins, India, Old and New, pp. 145 ff.
5. L. D. Barnett, Bhagavad Gita (Temple Classics), pp. 79-80.

LIST OF REFERENCES

Chapter 1.

1. Clement of Alexandria (Ante-Nicene Library), vol. i, p. 355.
2. Smith, Dictionary of Christian Biography, vol. IV, p. 182(*a*), note (*a*).
3. Eusebius, Eccl. Hist. Bk. V, Chap. X.
4. Jerome, Liber de Viris Illustrilus, Ch. 36.
5. Jerome, Epistola LXX. Letter to Magnus.
6. Clement of Alexandria (Ante-Nicene Library), vol. i, p. 399.
7. Neander, Church History, vol. i, p. 114 (Bohn. 1853).
8. W. Hunter, The Indian Empire, second edition, pp. 234-235.
9. Milne Rae, The Syrian Church in India, p. 137.
10. C. C. Torrey, The Four Gospels, pp. 237-286.

Chapter 2.

1. Mingana, The Early Spread of Christianity in India, pp. 18, 63.
2. *Ibid*, pp. 63-64.
3. *Ibid*, p. 63.
4. W. J. Richards, The Indian Christians of St. Thomas, Ch. 12.
5. Mingana, Early Spread of Christianity in India, pp. 42-45.
6. T. K. Joseph, Thomas Cana, pp. 19-22 (1928).
7. T. K. Joseph, The Magna Charta of the Malabar Christians.
8. T. K. Joseph, Thomas Cana (1928), p. 2.
9. Mingana, Early Spread of Christianity, p. 44.
10. J. N. Ogilvie, The Apostles of India, p. 50.
11. Vincent Smith, The Early History of India, appendix 3 (1914).
12. Lib. ii. Cap. 57.
13. Sozomen, Hist. Eccles., vii, 19.
14. Sir W. Muir, Life of Mohammad, p. 50.

Chapter 3.

1. See Legacy of Islam, by Sir Thomas Arnold and A. Guillaume.
2. Gibbon, The Decline and Fall of the Roman Empire, Ch. 47.
3. History of the Holy Eastern Church, General Introduction, vol. i, p. 143.
4. Malcolm, History of Persia, vol. i, p. 259.
5. Judgment of the District Judge of Trichur, dated 17th April 1920. Suit Relating to the Syro-Chaldean Church in India.

28. Judgement of the District Court, Kottayam, 1943.
29. Judgement of the District Court, Kottayam, in O. S. 111 of 1118 (1943).
30. Kaye, Sir John, .. Christianity in India (1859).
31. Keays .. .. History of the Syrian Church (S. P. C. K.).
32. Koshi, T. N. .. A Brief Sketch of the Mar Thoma Syrian Church of Malabar.
33. Kuriakos, Father .. The Orthodox Syrian Church of Malabar (1943).
34. Mackenzie, G. T. .. Christianity in Travancore (1901).
35. Medleycott, Bishop India & Apostle Thomas.
36. Mingana .. .. The Early Spread of Christianity in India.
37. Ogilvie, J. N. .. The Apostles of India.
38. Otto .. .. India's Religion of Grace & Christianity.
39. Phillip, E. M. .. The Indian Church of St. Thomas.
40. Radhakrishnan, S. Indian Philosophy.
41. Rae, Milne .. The Syrian Church in India.
42. Richards, W. J. .. The Indian Christians of St. Thomas.
43. Salem, A. B. .. Cochin Jew Town Synagogue.
44. Smith, George .. The Conversion of India.
45. Stewart, J. .. .. Nestorian Missionary Enterprise.
46. Telang .. .. The Bhagvad Gita in S. B. E., Vol. 8.
47. The Three Great Acharyas.
48. The Travancore Law Reports, The Syrian Church Case, 1946.
49. Varghese, M. .. A Brief History of Pilayur Church.
50. Westcott .. .. Kabir & Kabir Panth.
51. Zaleski, L. M. .. The Saints of India.
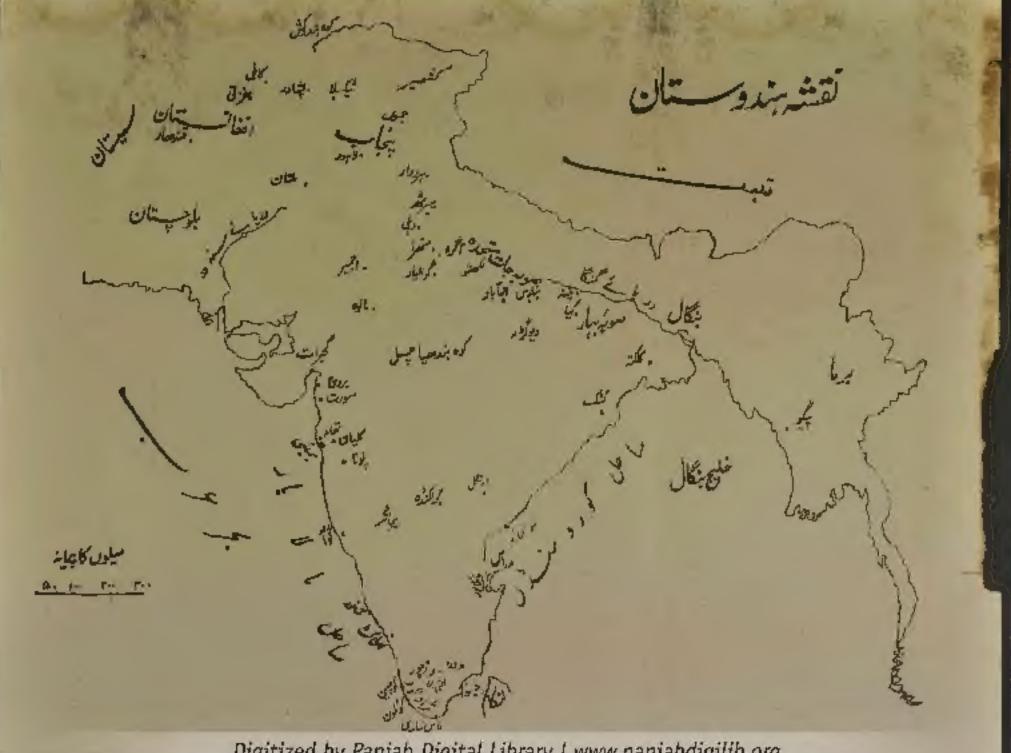
نقشہ ہندوستان
تبت
افغانستان
بلوچستان
پنجاب
کشمیر
بنگال
برما
خلیج بنگال
گجرات
کوہ بندھیاچل
میلوں کا پیمانہ
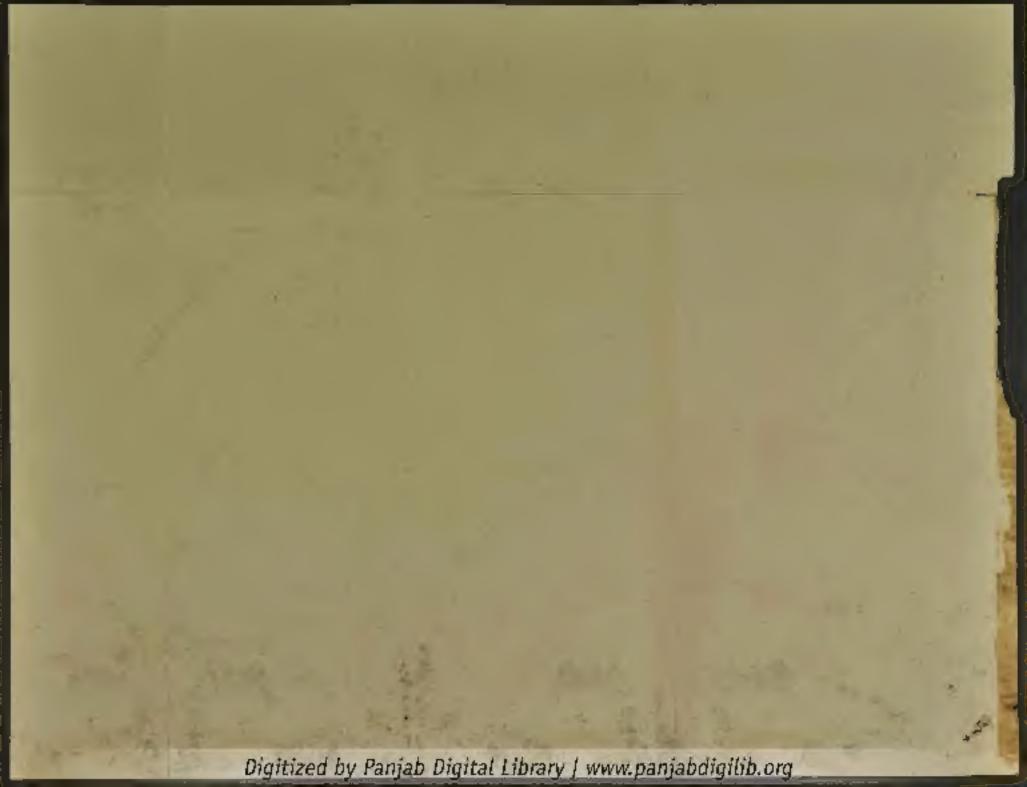
LIST OF BOOKS.

The following books have been consulted in the preparation of this volume :—

1. Adeney .. .. The Greek and Eastern Churches.
2. An Anglican Syrian — The Malabar Syrian Church and the See of Antioch.
3. Bernard, Father .. A Brief Sketch of the History of the St. Thomas Christians.
4. Bhandarkar, R. G.. Vaisnavism, Saivism and Minor Religious Systems.
5. Cheriyan, P. .. The Malabar Syrians and the Church Missionary Society.
6. Daniel, J. .. .. The Syrian Church of Malabar.
7. Farquhar .. .. Gita & Gospel.
8. ,, ... Outlines of the Religious Literature of India.
9. ,, ... Primer of Hinduism.
10. Gibbon .. .. Decline & Fall of the Roman Empire.
11. Hastings .. .. Encyclopaedia of Religion and Ethics, Vols. 2, 5, 7, 10 and 11.
12. Hosten, Father .. Antiquities.
13. Hough, James .. History of Christianity in India, Vols. 1 & 2.
14. Howells .. .. The Soul of India.
15. Hunter .. .. The Indian Empire (2nd Edition).
16. Joseph, T. K. .. Thomas Cana (1928).
17. ,, ... A Christian Dynasty in Malabar.
18. ,, ... Ancient Malabar (Maharaja College, May, Dec., 1946).
19. ,, ... An Indian Christian Date A. D. 317 (Journal of Indian History—April, 1948).
20. ,, ... Constantine & Indies (Journal of Indian History—April, 1950).
21. ,, ... King Pallivaanavar (1948).
22. ,, ... Malabar Christians & Their Ancient Monuments.
23. ,, ... Mar Sapor & Mar Prodhi.
24. ,, ... St. Thomas' Crosses & St. Thomas Tounditions (Indian History Quarterly, Vol. viii, 1932).
25. ,, ... The Kottayam Crosses & the Valiapalli Church.
26. ,, ... The Magna Charta of the Malabar Christians.
27. Jacob .. .. A Manual of Hindu Pantheism.

تصنیفات پادری برکت اللہ صاحب ایم۔ اے

نور الہدیٰ لمن اھتدیٰ — خواجہ کمال الدین قادیانی کی ایک گمراہ کن کتاب ینابیع المسیحیت کا دندان شکن جواب مشتمل بر دو حصہ قیمت ہر دو حصہ ۱۴ر

صحت کتب مقدسہ — جس میں کتاب مقدس کے مجموعہ کی صحت کو تنقیدی اصول کے مطابق پرکھ کر ثابت کیا گیا ہے علم الٰہیات کے مدرسوں کے کورس میں شامل ہے۔ دوسری ایڈیشن

کلمۃ اللہ کی تعلیم — میں خداوند مسیح کی تعلیم کی توضیح کر کے اس کو بے نظیر ثابت کیا گیا ہے۔ پادری صاحب کو اس کتاب کے لکھنے کے لئے انعام ملا ہے۔ قیمت ۸ر

دین فطرت اسلام یا مسیحیت — میں ثابت کیا گیا ہے کہ صرف مسیحیت ہی فطرت کے جبلی میلانات کو پورا کرتی ہے۔ قیمت ۸ر

مسیحیت کی عالمگیری — میں ثابت کیا گیا ہے کہ صرف مسیح اور مسیحیت ہی عالمگیر ہیں۔ قیمت ۸ر

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟ — میں ہر پہلو سے اس موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۸ر

معجزۂ قانائے گلیل الیٰ ابی لما شبقتنی — میں مرحوم مولوی ثناء اللہ کے اعتراضات کا دندان شکن اور مسکت جواب ہے۔ قیمت ہر جلد ۵ر

۹

صلیب کے علمبردار:۔ میں پنجاب کی ممتاز کلیساؤں کے اولین مشنریوں کا ذکر ہے۔ قیمت ۸ر

دشت کربلا یا کوہِ کلوری ؟ میں خداوند مسیح کے مصلوب ہونے اور امام حسین کی موت کے اسباب و نتائج پر بحث کیگئی ہے۔ قیمت ۱ر (ایک آنہ)

محمد عربی:۔ میں بانیٔ اسلام کی زندگی کے صحیح واقعات کو قرآن و حدیث سے جمع کیا گیا ہے۔ مسلم علماء نے اس کتاب کی تعریف کی ہے۔

توضیح البیان فی اُصول القرآن میں ثابت کیا گیا ہے۔ کہ اسلام صرف محمد صاحب کے زمانہ کے عرب کے لئے ہی موزوں تھا۔ قیمت ۵ر (پانچ آنہ)

اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی ؟ اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے کہ خداوند مسیح کا پیغام صرف قوم یہود تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ اقوام عالم کیلئے تھا۔ قیمت ۵ر

مسیحیت اور سائنس میں ثابت کیا گیا ہے کہ ان دونوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں قیمت ۱ر (ایک آنہ)

مسیحیت یا اشتراکیت میں اشتراکی اصول کو مسیحی تعلیم کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے قیمت ۱ر (ایک آنہ)

مقدس توما رسولِ ہند تاریخ کلیسیائے ہندوستان و پاکستان کا پہلا حصہ قیمت عہ ۱۲ر (ایک روپیہ بارہ آنہ)

ملنے کا پتہ

پادری برکت اللہ صاحب ایم اے۔ انارکلی بٹالہ مشرقی پنجاب